اِنَّا مِنَ اللہ اِنَّا اِلَی اللہ - اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیہِ مَسْئُونَہ

کُم ڈُو مَوت

حصہ اوّل

یعنی اہل عقبے کو آخرت یاد دلانے اور عشق دنیا کی بھول سے بچانے میں

حصار الحیات

جسکو

کفن بر سر بستہ حسن نظامی دہلوی نے لکھکر لکھوا کر اور جمع کر کے کتاب کی

صُورت دی،

اور پیرزادہ سیّد محمدؐ صادق صاحب کارکن حلقۃ المشائخ دہلی نے

بماہ رجب المرجب ۱۳۳۵ھ مطابق مئی ۱۹۱۷ء

شیخ فضل حسین صاحب کے ہلالی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا
ابو یوسف

البرزخ

بین الحیات و الممات

دست قدرت حکیم حافظ محمد اجمل خاں صاحب حاذق الملک کو خدا تعالیٰ نے اہل ہند کی حیات و ممات کا بلحاظ طب برزخ الکبریٰ بنایا ہے ۔

میری کتاب **موت** یاد دلانے کو دنیا کے پاس جاتی ہے۔ دنیا موت سے جان چھڑانے کو **حاذق الملک** کے پاس آتی ہے۔ یہ کتاب کسی کو آئی اجل سے بچا سکتی ہے نہ حاذق الملک کسی کی آئی ہوئی کو ٹال سکتے ہیں بلکہ وہ خود بھی ایک دن مرنے والے ہیں یہ کتاب بھی فنا ہونے والی ہے اور اسکا مرتب کرنے والا بھی ۔

حاذق الملک جان بچانے کا مجازی سہارا ہیں۔ یہ کتاب ایمان یاد دلانے کا حقیقی نقارہ ہے انکو خلقت اکثر آخری وقت پاس بلاتی ہے یہ کتاب اول وقت مخلوق کے پاس جاتی ہے وہ بھی **برزخ الحیات والممات** ہیں اور یہ بھی ۔

لہٰذا اس زمانہ میں جبکہ نسل آدم شوق زیست اور تمنائے بقا اور آرزوئے حیات دنیا میں آخرت و عقبیٰ کی زندگانی دوام کو بھول گئی ہے۔ میں یہ کتاب شائع کرتا ہوں اور خادم خلق اللہ حاذق من اللہ حکیم **حاذق الملک** کے نام اسکو منسوب کرکے گم تو دارالبقا میں دارالفنا پکارتا ہوں ۔ میں نہ رہونگا۔ حاذق الملک نہ رہینگے مگر **نسبت نامہ** قیامت تک زندہ رہیگا۔ یہ کتاب حشر تک باقی رہیگی۔ اور منسوب الیہ کے اسم حاذق کو بھی خدا اسکے ساتھ بقائے طویل دیگا ۔

تحریر میں بسیرا درگاہ حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ
دہلی۔ مئی ۱۹۱۷ء

حسن نظامی

کم ٹو موت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

جس قوم کا زوال قریب ہوتا ہے وہ موت کے وقت کو بھول جاتی ہے
یا جان بوجھ کر مرنے کا خیال سامنے نہیں آنے دیتی۔ تاکہ عیش زندگی
کرکرا نہ ہو قلعہ دہلی کے قصے مشہور ہیں کہ اُن مغل بادشاہوں کی
اولاد جنہوں نے ہمیشہ دریائے مرگ کے کنارے کھڑے ہو کر ملک فتح
کئے۔ اب آخر زمانہ میں ایسی ہو گئی تھی کہ اگر کوئی اسکے سامنے کلمہ توحید
پڑھتا تو وہ کانوں میں اُنگلیاں دے لیتی تھی تاکہ وہ چیز جو مرتے وقت
پڑھی جاتی ہے کانوں میں نہ پڑے سورۂ یٰسین کو قلعہ دہلی کی بیگمات
نناوی کے نام سے یاد کرتی تھیں۔ یعنی مار ڈالنے والی سورت
اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ بادشاہ کا یہ عالم تھا کہ وہ جب درگاہ حضرت
محبوب الٰہیؒ کی زیارت کو آتے تو محمد شاہ بادشاہ کے مقبرہ پر پردے

ڈلوا دیئے جاتے تھے کیونکہ امیروں وزیروں کو خوف تھا کہ کہیں بادشاہ کی نگاہ بادشاہ کی قبر پر نہ پڑ جائے اور زندگی کے انجام کار کا دھیان انکو تکلیف نہ دے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ موت ان سب کو کھا گئی عیش و عشرت ملیامیٹ ہو گئے اور آج انکی خوابگاہوں میں یورپ والے جوتیوں سمیت سیر کرتے پھرتے ہیں۔

یہ بڑے خوف کا مقام ہے۔ انسان کو ہر وقت آخری منزل کا کھٹکا دل میں رکھنا چاہئیے۔ ہمارے آقائے نامدار مقبول پروردگار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص رات دن میں چالیس مرتبہ موت کو یاد کرلے وہ شہید کا درجہ پائیگا۔ اسکی وجہ صاف ظاہر ہے کہ شہید کو تو ایک دفعہ موت کا مزہ چکھنا پڑتا ہے مگر جو شخص رات دن میں چالیس دفعہ موت کا خیال کرے تو وہ گویا ہر بار موت کا ذائقہ چکھتا ہے۔ اس لیے اس کا رتبہ شہید کے برابر ہو تو کیا تعجب ہے

ہمارے رسول صلعم موت کو اس قدر قریب جانتے تھے اور ہر وقت مرنیکے لئے اتنے آمادہ رہتے تھے کہ اگر آج کل کے آدمی اُس کا ذکر سنیں تو حیران ہو جائیں۔ ایک دفعہ آپ نے چاروں اصحاب رضوان اللہ علیہم اجمعین سے دریافت کیا کہ تم وقت کو کتنا قریب

سمجھتے ہو۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے عرض کی صبح کی نماز پڑھنے کے
بعد مجکو امید نہیں رہتی کہ ظہر کی نماز تک زندہ رہوں گا فاروق اعظمؓ
نے کہا کہ میں ظہر پڑھ کر عصر کا وقت ملنے سے ناامید ہو جاتا ہوں۔
عثمان غنیؓ بولے مجکو عصر کے بعد مغرب کی آس باقی نہیں رہتی۔
حیدر کرارؓ نے التماس کی کہ مغرب ادا کرنیکے بعد عشا کا بھروسہ نہیں رہتا ہے
یہ سنکر ہمارے آقا رسولؐ نامدار نے ارشاد فرمایا کہ قسم ہے اُس ذات
کی جسکے قبضہ میں محمدؐ کی جان ہے۔ جب میں نماز میں ادہنی طرف
سلام پھیرتا ہوں تو مجکو بائیں جانب گردن پھیرنے کا یقین نہیں رہتا
اور خیال آتا ہے کہ ممکن ہے کہ اس سے پہلے موت آجائے
جنکو مرنے کا اتنا یقین تھا وہ آج کا کام آج ہی ختم کردینا چاہتے
تھے اس واسطے ان میں نہایت مستعدی جفاکشی اور استقلال
کے اوصاف پائے جاتے تھے۔
اب ہم لوگوں کا یہ حال ہے کہ کالر نکٹائی لگا کر بوٹ پہن کر موٹر
کو نکلتے ہیں اور راستہ میں کوئی جنازہ مل جاتا ہے تو منہ پھیر لیتے
ہیں) ۔ ہمکو ڈر ہوتا ہے کہ مرنے کا خیال ہمارے دماغ کو مضمحل کردیگا
اور ہم کچہری کا کام اچھی طرح نہ کر سکیں گے۔ مگر کاش ہمکو بہادر شاہ
کی مذکورہ مثال سے عبرت ہو جنھوں نے دماغ کی حفاظت میں

ملک غارت کر دیا یقین مانو اگر ہم موت کے خوف سے اسکو بھولنا یا بھلانا چاہیں گے تو ہماری ہستی ناپید ہو جائیگی اور فنا ہمارے بقائے ظاہری کو نابود کر دے گی۔

یہ جتنے امیر اور روپئے والے لوگ ہیں یا یہ جسقدر تاج و تخت کے مالک کہلاتے ہیں موت کے نام سے ان کا دم فنا ہوتا ہے۔ مرنے کا ذکر کرو تو ان کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگتی ہیں بات کاٹ کر اور ذکر کرنے لگتے ہیں۔ لیکن ان بدنصیبوں کو خبر نہیں موت کا وقت قریب آرہا ہے۔ وہ ایک دن انکی گردن مروڑ کے رکھ دیگا۔ ان کا سب یہ مال و دولت تاج و تخت دوسروں کے حصہ میں تقسیم ہو جائیگا۔

اس دن یہ چار گز کپڑے کے کفن کو دوسروں کے محتاج ہونگے اور جو لوگ آج انکی خیر خواہی میں پسینہ پر خون گرانا چاہتے ہیں جھوٹی مخبریاں کر کے ان کے ہاتھوں سے بے گناہوں پر ظلم کراتے ہیں وہ بیک بینی و دو گوش قبر کی اندھیری کوٹھری میں پھینک کر چلے آئیں گے جہاں نہ برقی لیمپ ہونگے نہ گیس کے ہنڈے البتہ دوزخ کی آگ کے شعلوں اور قہر خدا کے شراروں اور عذاب کے فرشتوں کی چمکتی ہوئی خوفناک آنکھوں کی روشنی ضرور ہوگی۔

لوح محفوظ اور افق مستور کے حجابات اُٹھ جائیں تو
میں ان کو وہ سب کچھ دکھا سکتا ہوں جو میری آنکھیں دیکھتی ہیں
مگر قدرت ان پردوں کی ڈوری پکڑے کھڑی ہے کسی کو چھپے ہوئے
بھید تک جانے نہیں دیتی۔ اور جو جا سکتے ہیں اُنکو کہنے نہیں دیتی
کس بھول میں ہو۔ وقت آخر آن پہنچا۔ کوچ کی تیاری کرو۔ ریل کا
لائن کلیر ہو چکا اور تمنے ابتک بستر بھی نہیں باندھا۔
یہ جو عشرت خانوں میں کمانی دار پلنگ پر پڑے خراٹے لے
رہے ہیں۔ یہ جو تفریح اور ہنسی خوشی کو باعث زندگانی سمجھتے ہیں
یہ جو یورپ میں بیٹھکر تمہارے لئے کتابیں لکھتے ہیں کہ خوب ہنسو
عمر دراز ہوگی۔ موت کا فکر پاس نہ آنے دو ہمیشہ سلامت رہوگے
یہ سب کے سب نزع کی بیقراری میں بہت جلد گرفتار ہونیوالے ہیں
اسوقت ان کی زبان بند ہو جائے گی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائینگی
ایڑیاں رگڑینگے۔ ٹانگیں پھیلینگے اور بے کلی سے کبھی سمیٹیں گے۔
کبھی پھیلائینگے۔ یاروں دوستوں۔ بال بچوں۔ مال دولت۔
گھر بار کو حسرت و مایوسی سے دیکھیں گے۔ سانس سینے میں
ٹھوکریں کھائیگا بدن ٹھنڈا پڑ جائیگا۔ دم کھنچ کھنچ کر آنکھوں میں آئیگا
اور ان میں نشتر چبھوئیگا۔ جس طرح یہ زندگی میں دوسروں کی جان آزار ہے

کرتے تھے نام نمود کے لئے پرائی جانوں کو بے گناہ برباد کر تے تھے۔ تاج و تخت کی ہوس میں دغا فریب ظلم و ستم۔ جفاکاری و خونریزی انکا شیوہ ہوگیا تھا آج انکی آنکھوں کے حلقوں میں حساب کتاب کے دفتر کھولے جائینگے آج انکو معلوم ہوگا کہ جس سے ڈرتے تھے گھبراتے تھے چھوت کا انتظام کرتے تھے۔ صفائی اور ڈس انفکٹ پر توکل کرتے تھے۔ وہ چیز کسی سے نہ رکی اور آگئی اب یہ سارا ساز و سامان دھرا رہ جائیگا۔ اب کوئی ڈاکٹر نہیں ہے جو جان کو بچائے اب کوئی پہرہ والا نہیں ہے جو موت کے فرشتے کو اندر آنے سے روکے۔ اس گھڑی کس کی مجال ہے کہ ڈپلومیسی اور پالیسی سے موت کی بلا کو ٹالے سب لن ترانیاں ہیچ ہوگئیں۔ ساری طراریاں عاجز آگئیں۔ قصہ مختصر موت یاد رکھنے کی چیز ہے۔ ہندوستانیوں کی سب سے بڑی خدمت یہ ہے کہ ان کو وقت آخر بار بار یاد دلایا جائے اگر ان کو کام کا آدمی بنانا ہے تو صاف صاف کہنا چاہئے کہ جتنی زندگی ہے اس کو غنیمت جانو اور نیکی و پارسائی سے کام شروع کرو۔ وقت ضائع نہ کرو۔ کل خبر نہیں کیا پیش آجائے۔ جو کچھ کرنا ہے آج ہی کر لو۔

دولہا دلہن کی موت

جودت نصرتی اکیس سالہ ترک نے ازادر ایڈریانوپل کے محاصرے سے ایک دن پہلے اپنی سسرال میں خوش وخورم بیٹھا سگرٹ کا دھواں اڑا رہا تھا۔ اسکی شادی کو پورے سات دن بھی نہیں ہوئے تھے ارمان بھری دلہن کے سوا کمرہ میں کوئی نہ تھا ترکوں کے دستور کے سوافق یہ لڑکی بھی گانا اور باجا بجانا جانتی تھی اسلیئے شوہر کی خوش باشی خاطر اسنے اپنا سریلا قانون باجا بجانا شروع کیا۔

جودت۔ باجے کی مستانہ نواؤں سے جھومنے لگا۔ اسنے اپنی کرچ کو زمین پر ٹیک کر بغل میں دبا لیا۔ اور اپنی گیسو دراز بیوی سے جنگی گیت گانے کی فرمایش کی۔ شرمیلی ترکن نے مسکرا کر دھیمی مگر سمجھ میں آنیوالی آواز سے "بسر وچشم" کہا۔ اور بولی۔ آپ یہاں بھی قتل گاہوں کو نہیں بھولتے۔ جودت نے اپنی چھوٹی سی سرخ مونچھ کو مروڑا۔ اور کہا۔ ہاں میں عشرت خانوں کی بہار میں جنگ کے خارستان کو یاد رکھنا قومی فخر سمجھتا ہوں۔ تم انگلیوں سے کھود قانون کے نغموں میں میری خوراک پیدا کریں۔ اور تم اپنی شیریں آواز سے اس پر نمک ڈالو۔

قانون کے بھاری سُر ران خانے میں گونجنے لگے۔ اور ترکن نے یہ گیت شروع کیا۔ جب جوانمردوں نے تیغ کے قبضہ پر ہاتھ رکھا۔ دشمن تھرّا گیا۔ ہاتھ جوڑنے لگا۔ اور جب توپوں کو بتّی دکھائی گئی۔ پہاڑ اور جنگل حواس باختہ ہو گئے۔ ہمارے سپاہیوں نے آج خون میں لتھڑے ہوئے ہاتھوں سے کھڑے کھڑے قہوہ کی پیالی پی۔ کیونکہ وہ جاں سے ہاتھ دھو کر میدان میں نکلے تھے۔

جودت اس نغمہ سرائی میں محو تھا اور باہر اسکو کوئی شخص آواز دے رہا تھا۔ قانون کی آواز ذرا مدھم پڑی تو اُسنے سنا کوئی اُسکو پکارتا ہے فوراً باہر نکلا۔ دیکھا شکری پاشا کا اڈیکانگ ہے۔ اُسنے کہا نصرتی دشمنوں کی فوجیں قریب آگئیں۔ شکری آفندی نے یاد فرمایا ہے کہ کپتان جودت نصرتی جس حال میں ہوں فوراً ہمراہ لیکر آؤ۔

جودت اُلٹے قدموں اندر آیا۔ بیوی سے رخصت ہوا۔ کرچ لگا۔ ٹوپی سر پر رکھ اڈیکانگ کے ساتھ چل دیا۔

غنیم نے اڈریانوپل کو گھیر لیا تھا۔ شدت سے گولہ باری ہو رہی تھی پچھلی رات توپیں ذرا خاموش ہوئی تھیں کہ اتنے میں قلعہ کے باہر کچھ سوار نہایت سکوت کے عالم میں دشمن کی فوج کی طرف جاتے ہوئے دکھائی دئے یکایک بندوقوں کے فیر کی آواز آئی۔

اندھیرے میں شعلے چمکے اور سامنے کی لائن میں افراتفری اور بھاگ دوڑ ہونے لگی۔

صبح کا نور نمودار ہوا۔ بلغاری لشکر نے ترکوں کو اپنے مورچوں پہ سنگینیں مارتے دیکھا وہ گھبرا گئے۔ اوسان جاتے رہے۔ کپتان جودت نصرتی اور اُسکی بیوی گھوڑوں پہ سوار تلواریں اُٹھائے ساتھیوں کو للکار رہے تھے۔

اسوقت بڑی گھمسان کا رن تھا۔ دلہن ترکن کے لمبے بال شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ وہ پستول سے اپنے دولہا پر حملہ کرنے والوں کا خاتمہ کر رہی تھی۔ اتنے میں ایک ظالم بلغاری نے بندوق پر چڑھی ہوئی سنگین پیچھے سے اس مرادوں والی ناشاد دلہن کی کمر میں ماری۔ جو سینے کے پار نکل گئی مہندی لگے ہوئے ہاتھوں سے پستول چھوٹ پڑا۔ اور بلبلا کر سینے کو تھام لیا گیا چند سکنڈ کے بعد وہ چکرا کر گھوڑے سے گری۔ اور موت کے وقت کے بے ربط الفاظ میں اتنا منہ سے نکلا۔ جودت خدا حافظ۔

ترک سوار اپنے افسر کی بیوی کا یہ عالم دیکھ کر چاروں طرف سے گھر کر ایک جگہ جمع ہو گئے۔ اور دشمن پر غضبناک حملے کرنے لگے۔ جودت گھوڑے سے کود پڑا مرد سی پلنگ پر لیٹنے والی کی لاش کو

خاک سے اُٹھالیا۔ پسینہ آلود پیشانی جسپر موت کی زردی کھنڈی
ہوئی تھی چومی سنگین خوردہ سینے کو سینہ سے لگایا۔ اور بے قرار
آنکھوں سے آسمان کو دیکھا۔ وہ خدا سے کہنا چاہتا تھا کہ وہ اس
قربانی کو قبول کرے۔ اسکا دل عشق اور مایوسی میں دیوانہ ہوگیا تھا
مگر اسے دیکھا یہ وقت غفلت کا نہیں ہے۔ دشمن ساتھ کے سپاہیوں
کو ختم کیے دیتا ہے۔ اسلئے اُسنے لاش دو سواروں کے سپرد کی کہ
جس طرح ممکن ہو قلعہ میں پہنچاؤ۔ اور خود تلوار اُٹھا کر زخمی شیر کی طرح دشمن
کی صفوں میں گھس گیا اسکی زبان پر ایک نعرہ تھا۔

میں توحید کا فدائی ہوں میں نے اپنی زندگی کی سب امیدیں اپنی
وحدت کی قربانگاہ میں چڑہائی ہیں۔ اب میرے دل میں زندگی کی
محبت نہیں ہے۔ اب میں عربی رسول ؐ کی آبرو پر نثار ہونا چاہتا ہوں
ہتھیار و۔ میرے ساتھ چلو۔ جنت میں میری پیاری کا دل تنہائی میں
گھبراتا ہوگا۔ تھوڑی دیر یہ آواز آئی۔ اسکے بعد دیکھا تو ایک تڑپتی ہوئی
لاش گھوڑے سے زمین پر گرتی ہوئی نظر آئی جسکے منہ سے آخری
لفظ یہ نکلا (اشہد ان لا الہ الا اللہ و اشہد ان محمد رسول اللہ)
یہ حودت نصرتی دولھا کیتان تھا جو اپنی دلہن کے آدہ گھنٹے بعد دنیا
سے رخصت ہوا۔ اور کہہ گیا کہ موت دولھا دلہن کو بھی آجاتی ہے وہ بھول میں ہیں

سکرات موت کی ہچکیاں

گرمی کے موسم میں محمد شاہ بادشاہ پائیں باغ کے حوض پر شام کے
وقت محفل جمایا کرتا تھا۔ حوض میں گلاب کیوڑے کے فوارے چھوٹتے
در و دیوار پر خس کا عطر چھڑکا جاتا اور پری چہرہ خواصیں علیش شاہ بادشاہ
کو برابر پنکھا جھلتی رہتی تھیں۔

ایک دن گل خانم نام ایک گجراتی چھوکری عطر کا کنستر لئے دیوار و
پر عطر چھڑکتی پھرتی تھی کہ بادشاہ محل سے برآمد ہو گئے۔ لونڈی ہی
آئی تھی گجرات کے عالم۔ نئی نئی تھی۔ رعب شاہی سے ہاتھ پاؤں
پھول گئے۔ بے اوسان ہو گئی۔ اور کنستر ہاتھ سے چھوٹ کر ٹوٹ گیا
بادشاہ بالکل قریب آ گئے تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک سترہ سالہ کمسن
مظلوم صورت نازنین سہمی ہوئی کھڑی ہے۔ کبھی شکستہ کنستر کو دیکھتی ہے
کبھی بادشاہ کی صورت کو۔ شاہی سواری رک گئی۔ پوچھا گیا کیا حال
ہے۔ بولی شیشۂ کامرانی ٹوٹ گیا جمال سلطانی امید کے شکستہ شیشۂ دل
کو جوڑ دیا کرتا ہے۔ دیکھتی ہوں یہ شیشہ بھی جڑتا ہے یا نہیں۔ ادا پسند
بادشاہ کو یہ بات بھلی اور حاضر جوابی بھا گئی۔ فرمایا نام کیا ہے۔ عرض کیا
"نشیمن بلبل" اس پر بادشاہ ہنس پڑے۔ بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ پاس کر

آداب بجالائی اور ہاتھ باندھ نظریں نیچی کر دوزانو بیٹھ گئی۔ ارشاد ہوا
بلبل کا نشیمن ایک جگہ نہیں رہتا آج اس گلستان میں کل اس چمن
میں پرسوں کسی اور غنچہ پر۔ عرض کی جہاں پناہ کے اقبال سے یہ
لونڈی وہ گل ہے جسکو دیکھکر بلبل پھر کسی پھول کے پاس نہیں جاتا
ایک ہی جگہ نشیمن بنا لیتا ہے۔

حکم ہوا اس کو محل میں لیجاؤ۔ نہلاؤ۔ دھلاؤ۔ حرم شاہی بناؤ۔ چند روز
کے بعد یہ کیفیت ہو گئی کہ گل خانم تمام محل کی بیگمات سے زیادہ منظور نظر
بن گئی۔ ایک لمحہ کے لئے بادشاہ اپنی آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتے
تھے۔ ایک برس تک یہی عالم رہا۔ دوسرے سال سردی کے موسم
میں گل خانم بادشاہ کے پاس تھی۔ کروٹ جو لی تو بچھونے میں کوئی
چیز چبھی۔ اور پسلیوں میں جلن ہونے لگی۔ پاس ادب مانع تھا۔
ضبط کیا مگر نہ ہوسکا۔ بے اختیار منہ سے اُف نکل گئی۔ بادشاہ گھبرا کر
پوچھنے لگے خانم کیا ہوا۔ خیر ہے۔ بولی جہاں پناہ خاطر جمع فرمائیں
کوئی تردد کی بات نہیں ہے دل کے پاس کوئی چیز خلش کرتی ہے
حضور نے اسی وقت پہرے والے کو آواز دی لونڈیاں حاضر
ہو گئیں۔ شمع قریب لائی گئی بچھونے کو دیکھا تو ایک چھوٹا سا نشتر
چارپائی میں اس قرینہ سے رکھا ہوا تھا کہ نوک کروٹ لینے والے کے

چھپ جاے - فوراً گل خانم کی گرم صدری اُتاری گئی - دیکھا دل کے پاس ہلکا سا ایک زخم ہے حکیموں - جراحوں کی طلبی ہوئی - آن کی آن میں سب حاضر ہو گئے - تفتیش سے معلوم ہوا کہ کسی بیگم نے رشک حسد سے زہر کا بجھا ہوا نشتر رکھوا دیا تھا - وہ چبھا ہے - اب جان کی خیر نہیں کیونکہ دل قریب ہے زہر اثر کر چکا -

بادشاہ ہائے کر کے بیہوش ہو گئے - گل خانم نے اللہ بقال کو ہاتھ سے نہ دیا - گاؤ تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئی - اپنے تمام زیورات اور کپڑے طلب کئے - پلی ہوئی آغا مینا کا پنجرا بھی منگوایا اور سب چیزوں کو سامنے رکھ کر نگاہ حسرت سے دیکھا -

مینا رات کے سبب چپ تھی - اُس سے مخاطب ہو کر بولی لو پیاری تمہاری چاہنے والی دنیا سے رخصت ہوتی ہے - اب تم خدا کے حوالے - خبر نہیں میرے بعد تم پر کیا گزرے

اتنا بولنے پائی تھی کہ زہر کا اثر خون پر چھا گیا - گردن ڈھلک گئی - منہ میں کف آنے لگے - لونڈیوں نے دوڑ کر سہارا دیا - حکیم جراح دوائیں لیکر آ گئے مگر اس کا تو کام تمام ہو چکا تھا - شاہی خوابگاہ کی آرایش کا کیا کہنا - چپہ چپہ بہشت کا نمونہ تھا کافوری شمعیں روشن تھیں چھپر کھٹ میں بادشاہ بیہوش پڑے تھے جن کو خوشبوئیں

اور دوائیں سونگھا کر ہوشیار کیا گیا۔

بادشاہ اُٹھے۔ گل خانم کا سر اپنے زانو پر رکھا۔ اور دو آنسو آنکے اُداس چہرے پر ٹپکائے۔ خانم نے ذرا کی ذرا آنکھ کھولی اور کہا میرے آقا۔ میرے سلطان۔ میرے مالک۔ میرے تاجدار۔ پانی ایک گھونٹ۔ کلیجہ پھُپکا جاتا ہے۔ اننتے .. قام .. ٹہلہ... یاجا

اُف۔ آہ۔ میں۔ آہ۔ آہ۔ پانی۔ پیاس۔ میں جانہار۔ نامراد۔ جاتی ہوں اب اس زانو پر اور .. تھوڑا سا پانی۔ اس زانو پر اور سر ہوگا شمعیں ساتھ بھیجدو۔ قبر میں اندھیرا ہوگا میرے زیور میری سوکنوں کو نہ دینا۔ اللہ۔ اللہ۔ اوہ۔ مجھے اُٹھاؤ برف میں ڈالدو۔ آ۔ آ۔ آگ بدن میں۔ قاتل کو سہاگ مبارک ہم تو چلے۔ وہ بھی ایک دن اسی طرح پھڑک کے تڑپے۔ لاالہ الا اللہ۔ الا اللہ۔ الا اللہ۔ محمد۔ محمد۔ رسول رسول اللہ۔

یہ کہنے پائی تھی کہ غش آگیا۔ بدن تھرتھرانے لگا۔ آنکھیں پتھرا گئیں ناک کا بانسہ ڈھل گیا۔ اور زور سے ایک ہچکی سسکی کی طرح آئی۔

حاضرین نے بادشاہ سے عرض کیا۔ حضور اب اس میں کیا رکھا ہے دوسرے کمرے میں تشریف لے چلئے یہ سنکر بادشاہ نے مرنے والی کا سر زانو سے اُتار دیا اور تشریف لے گئے جانے کے بعد

گل خانم کو دو ہچکیاں اور آئیں۔ اسکے بعد سکرات موت اور زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

اے اس عبرت نامہ کے پڑھنے والو۔ سب کو یہ وقت پیش آنا ہے۔ اس سے غافل نہ رہو۔ گناہوں سے توبہ کرو۔ اور اُس زندگی کا اسباب راحت خریدو جہاں موت نہیں ہے۔

قبر کی اشرفیاں

ایک کنجوس روپئے والے کی موت کا بیان

ایک شخص بہت مالدار تھا۔ اسکے کئی بچے تھے۔ مگر وہ اپنی دولت خرچ کرنی نہ چاہتا تھا۔ موٹے جھوٹے کپڑے پہنتا اُبالی رال کھاتا میلے کچیلے پھٹے پرانے بچھونے پر سوتا اور اسی حال میں بچوں کو رکھتا تھا

جب بچوں نے ہوش سنبھالا تو انھوں نے خیال کیا۔ ہمارا باپ اتنا پیسے والا ہے۔ مگر ایسے غریبی حال میں کیوں رہتا ہے۔ ایک دن انھوں نے باپ سے پوچھا کہ باوا جان یہ کیا بات ہے کہ اور لوگ جب انکو خدا کھانے پینے کو دیتا ہے تو اچھے سے اچھا کھاتے ہیں اچھے سے اچھا پہنتے ہیں لیکن آپ ہمیشہ مفلس کنگالوں کی طرح رہتے ہیں۔ اور ہم کو بھی رکھتے ہیں۔ آخر یہ دولت کس دن کام آئیگی

باپ نے ہنسکر کہا - نادان روپیہ جمع کرنے کے لیئے ہے یا خرچ کرنے کے واسطے - یہ جتنے اُجلے اُجلے کپڑے والے سفید پوش بازاروں میں پھرتے ہیں بس یہ اُنکا خالی لفافہ ہی لفافہ ہے اندر کچھ بھی نہیں - وقت پڑے تو دو روپئے بھی ان کے گھر میں نہ نکلیں - اور میں چاہوں تو لاکھوں روپیہ ایک وقت میں نکال سکتا ہوں - یہ سنکر بچوں نے کچھ اور بولنا چاہا مگر باپ نے دھمکا کر چپکا کر دیا - اور کہا میں زیادہ باتیں نہیں سنتا آدمی کو چاہیئے کمائے اور جمع کرے - خرچ کرنیکا نام لوگے تو گھر سے نکال دونگا -

بڑے بیٹے کو یہ بات بہت بُری لگی اور تاک میں رہا کہ باپ کی آنکھ بچے تو روپیہ چراؤں - آخر یہی ہوا - ایک دن باپ باہر گیا ہوا تھا - لڑکے نے کوٹھری کا کونا کھودا جہاں روپیہ دفن تھا اور سب توڑے نکال لئے - اسکے بعد مٹی ڈال کر جگہ برابر کر دی -

اب اسنے یہ روپیہ اُڑانا شروع کیا - خوب عیاشیاں کیں اور فضولخرچی میں سارا روپیہ برباد کر دیا - باپ کو ایک دن شبہ ہوا - اسنے لڑکے کے اچھے کپڑوں کو دیکھ کر دریافت کیا کہ یہ کہاں سے آئے - لڑکے نے جھوٹ موٹ باتیں بتائیں - مگر باپ کو یقین نہ آیا اور کوٹھری میں جاکر کونہ کھودا - تو روپیہ کی تھیلیاں غائب تھیں - یہ دیکھ کر اس کے

ہائے کا نعرہ مارا۔ اور کلیجہ پکڑ کے بیٹھ گیا آنکھیں پتھرا گئیں۔ لڑکا یہ
دیکھ کر بہت گھبرایا اور معافی مانگنے لگا اور کہا اب تو مجھ سے خطا
ہوگئی آیندہ نہ ہوگی۔ باپ نے کچھ جواب نہ دیا۔ اور کہا بازار سے
حلوا خرید لاؤ۔ لڑکا گیا اور حلوا خرید لایا۔ باپ نے اپنا کرتہ اُتارا۔
اندر ایک گدڑی پہنے ہوئے تھا اُسکو اودھیڑا تو اشرفیاں نکل آئیں
اسنے ان اشرفیوں کو ایک ایک کرکے حلوے میں رکھا اور نگل لیا
یہاں تک کہ ساری اشرفیاں اور حلوا کھا لیا۔ اور کہا تم اس قابل
نہیں ہو کہ دولت تم کو دوں۔ اسلئے میں نے سب کھالی۔
یہ کہہ کر وہ وہیں لیٹ گیا۔ دم توڑنے لگا اور مرگیا۔ لڑکوں نے
کفن کا سامان کیا اور قبرستان میں جاکر دبا آئے۔
اس بات کا چرچا سارے محلہ میں تھا۔ اور لوگ مرنے والے
کنجوس پر لعنت بھیجتے تھے۔ اس محلہ میں چند کفن چور بھی رہتے تھے
انھوں نے سنا تو وہ دن کے بعد رات کو کنجوس کی قبر پر گئے تاکہ
لاش کو چیر کر اشرفیاں نکال لیں۔ چنانچہ انھوں نے قبر کھودی
اور پٹاؤ کا پتھر ہٹایا۔ کیا دیکھتے ہیں لاش پھٹی پڑی ہو اور اشرفیاں
چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں۔ چور نے ایک اشرفی پر ہاتھ ڈالا
تاکہ اسکو اٹھائے۔ اشرفی کو ہاتھ لگانا تھا کہ یہ معلوم ہوا گویا آگ کی

چنگاری پر ہاتھ پڑا۔ بلبلا گیا۔ ہاتھ کھینچ لیا۔ اور قبر سے باہر آگیا۔ مگر ہاتھ کی جلن کم نہ ہوتی تھی۔ گھر آیا تو ہاتھ کو پانی میں ڈال دیا اُسوقت ذرا سے ذرا چین آیا۔ لیکن جہاں پانی سے ہاتھ باہر نکالا پھر وہی آگ لگنے لگی۔ تین دن یہی حالت رہی۔ بہتیرے علاج معالجے کئے ایک فائدہ نہ ہوا۔ یہانتک کہ تیسرے دن ہائے ہائے جلا۔ ہائے جلا چیختا ہوا مر گیا۔

کنجوسوں اور چوروں کا یہ انجام ہوتا ہے۔

بے چین مُردہ

غدر سے پہلے درگاہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کے پاس ایک مکان میں کوئی شاہ صاحب رہتے تھے۔ اس مکان کے صحن میں دہلی کے شہزادوں کا قبرستان بھی تھا۔ ایک دن کسی نوجوان شہزادہ کا جنازہ یہاں لاکر دفن کیا گیا۔ شاہ صاحب کا بیان ہے کہ جب رات ہوئی اور میں سو گیا تو ایکا ایکی کسی کی ہائے ہائے کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ حیران تھا کہ الٰہی یہ آواز کہاں سے آئی باہر صحن کی طرف خیال کیا تو معلوم ہوا ایک سایہ سا ہے جو قبر کے چاروں طرف دوڑتا پھرتا ہے۔ اسمیں سے آواز آتی ہے۔

ہائے ہائے۔ ارے میں جلا۔ ہائے میں جلا۔ شاہ صاحب کہتے ہیں ہیں ڈر کے مارے کانپنے لگا۔ مگر دل مضبوط کرکے میں نے زور زور سے کلمہ پڑھنا شروع کیا اور کہا میاں تم بھی کلمہ پڑھو عذاب کم ہو جائے گا۔

میرا اتنا کہنا تھا کہ آواز جاتی رہی۔ اور سایہ غائب ہو گیا میں لیٹ رہا اور آنکھ لگ گئی۔ تھوڑی دیر میں پھر وہی غل شور پیدا ہوا۔ آنکھ کھول کر دیکھا تو وہ سایہ اسی طرح قبر کے چاروں طرف گھبرایا گھبرایا پھر رہا ہے۔ اور ہائے ہائے کی آواز آرہی ہے۔

اب کے میری ہمت ٹوٹ گئی۔ اور خوف کے مارے بڑی دیر تک کلمہ منہ سے نہ نکلا۔ لیکن جب مُردہ کی بے چینی حد سے بڑھی تو میں نے پھر کہا کہ میاں کلمہ پڑھو۔ یہ سنتے ہی آواز خاموش اور سایہ غائب ہو گیا۔

صبح کو اس مُردے کے گھر والے پھولوں کی چادر چڑھانے آئے تو میں نے اُنسے رات کا قصہ بیان کیا۔ یہ سنتے ہی ایک بڑھیا عورت نے چیخ ماری اور رونے لگی۔ یہ اس مُردے کی ماں تھی۔ اسنے کہا مرنے والے کا سلوک میرے ساتھ اور اپنی بیوی کے ساتھ اچھا نہ تھا۔ میں نے اسی وقت اس کا قصور معاف

کیا۔ اور گھر جا کر اسکی نوجوان مظلوم بیوہ سے بھی قصور معاف کراؤنگی شاید ان گناہوں کے سبب اسکی پکڑ ہوئی ہو۔ اور معاف کر دینے سے بخشا جاسے اور عذاب سے چھٹکارا پائے۔

دیکھو ماں اور بیوی کو ستانے اور اُن پر ظلم کرنے کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔ ڈرو اور توبہ کرو۔ تم کبھی اپنی ماں بہن بھائی بیوی بچوں کو نہ ستانا۔

اہل آسمان نے مجھ سے کہا

تو دیکھ! علاؤالدین خلجی کیسا سلطان تھا۔ وہ تمام ہندوستان پر خود مختاری کی حکومت کرتا تھا۔ اس کی تلوار کا زور جنگلوں پہاڑوں میں مشہور تھا۔ اسکو دوسرا اسکندر بننے کی ہوس تھی۔ اسکے دربار کی شان و شوکت بے مثال تھی۔

مگر آج خیال کر۔ کیا وہ کہیں ہے؟ اسکی تاجداری کا کچھ نشان ملتا ہے؟ قطب مینار کے نیچے دیکھ۔ مغربی رُخ ٹوٹے پھوٹے در و دیوار ہیں خس و خاشاک کے انبار ہیں۔ یہاں اُس سلطان کا شاندار مقبرہ تھا مگر اب قبر کا تعویذ بھی باقی نہیں[1]۔ جہاں اس عظیم الشان سلطان کی

---

[1] انگریزی سرکار نے اب اس مقبرہ کی مرمت کرا کے قبر کا تعویذ بھی بنوا دیا ہے حسن نظامی

لاش دفن کی گئی تھی - وہاں ایک ویران گڑھا نظر آتا ہے - اور کچھ
نہیں - نہ یہاں مخملی شامیانہ ہے - نہ پہرے والے سپاہی ہیں - نہ آواز
دینے والے چوبدار ہیں - گھاس کے تنکوں چونے کے کنکروں -
خارا کے پتھروں میں مُردہ بدن خاک بنا پڑا ہے -

ذرا دوسری طرف نگاہ اُٹھا - غیاث الدین بلبن غلام خاندان کا
مشہور شہنشاہ اور اس کا بیٹا محمد خاں شہید شکستہ مقبروں میں پڑے
سوتے ہیں - انکے گور خانے بھی برباد و تباہ پڑے ہیں - اور نظر بڑھا
گیارہ گیارہ میل پرانی دہلی کے کھنڈروں کو دیکھ - کیا کیا محل تھے
کیسی کیسی مسجدیں و خانقاہیں تھیں - حویلیاں اور بلند عمارتیں تھیں
مگر اب سب سرنگوں پڑی دم توڑ رہی ہیں -

میں نے کہا - آسمان والو مجھ سے کیا کہتے ہو تم خود دیکھو بابل
نینوا - روما - کے آثار قدیم کا انجام دیکھ چکے ہو دہلی کو بھی اس پر
قیاس کر لو -

کیا تم مجھ سے کہوانا چاہتے ہو - کہ دنیا کے جاہ پرست نام نمود
کے طلبگار نئی عمارتوں کے بنانیوالے اگلے وقتوں کے اس انجام
سے عبرت حاصل کریں - لیکن مجھ سے نہ کہواؤ - لوح محفوظ میں دیکھو
کہ وہاں کیا لکھا ہے - اسکے بعد تم بھی انتظار کرو اور میں بھی راہ دیکھوں

موت کی گھڑی

اچھا لکھنے والے لکھ چکے اچھا بولنے والے بول کر تھک گئے
دلیل اور حجت کی بارش برستی رہی۔ عقل نے بہتیرا زور لگایا۔ تلوار نے
ہر چند دھمکیاں دیں مگر لامذہب کا انکار نہ ٹوٹا۔ وہ جہاں تھا وہیں رہا
کوئی ایک ثبوت پیش کرتا لامذہب چار تردیدیں سامنے لاتا
زبان اسکی تیز قلم میں اس کے روانی۔ علم میں پورا ارادہ کا پکا۔ بھلا کس کی
مجال تھی جو اسکو قائل کرتا اور مذہب کے آگے اس کا سر جھکاتا
لامذہب جانتا تھا جس چیز کا فطرت نے مذہب نام رکھا ہے وہ
فطرت انسانی کی ایسی رہنمائی ہے جو آدمی کو دائرہ انسانیت میں
قائم رکھ سکے۔ مگر جب میں خود اپنے عقل و ضمیر سے اتنی تمیز رکھتا ہوں
کہ سوسائٹی اور آدمیت کے خلاف کوئی بات ہاتھ پاؤں آنکھ کان
زبان یا اعضائے ظاہری و باطنی سے نہ کروں تو پھر کیا ضرورت ہے
کہ ایک ہجوم بے عقلاں میں شریک ہوں۔ اور مذہبی آدمی کہلاؤں
کیونکہ مذہب کے پابند زیادہ تر جاہل اور بے عقل لوگ ہوتے ہیں۔
اور مذہب کے راستہ میں چلنے والے کو بیشمار مضحکہ خیز بیوقوفی کی
رسمیں بھی ادا کرنی پڑتی ہیں۔ اور بعض اوقات تو مذہب آدمی سے

ایسی ناشائستہ حرکات جوش تعصبی میں کرادیتا ہی جو دانش اور ہوش انسانی کے سراسر منافی ہیں۔

غرض لامذہب کا انکار دن بدن پختہ ہوتا گیا پہلے تو لوگ اسکو سمجھاتے تھے تحریری و تقریری اثر اس پر ڈالنا چاہتے تھے۔ اور اب وہ خود دوسرے اہل مذہب کو فہمایش کرتا تھا اور عقل دلیل کے زور سے اس نے متعدد آدمیوں کو منکر مذہب بنا دیا تھا۔

جب اس نے دیکھا کہ میرا جادو چل سکتا ہی تو اس نے ایک کتاب اسلام اور عقلیت یا مذہب و عقل کے نام سے لکھ ڈالی اور اس کو شائع کر دیا۔

کتاب کے شائع ہوتے ہی توقع کے موافق اہل مذہب جوش میں آگئے۔ جہاں اس نے تعلیم پائی تھی اسکو برا بھلا کہنے لگے بعض نے نفس تعلیم کو صلواتیں سنادیں دو ایک نے عقل کے پتھر کا جواب عقلی پتھر سے دیا۔ لامذہب مسکرا مسکرا کر مزے لیتا تھا اسکو تو پہلے سے ان حرکات عجیب کا علم تھا وہ چاہتا تو اس پر ایک پیشیں گوئی شائع کر سکتا تھا۔ جو بالکل ہو بہو پوری اترے۔ مگر پیشیں گوئی کو بھی وہ مذہب کی ایک شاخ سمجھتا تھا۔ لہذا وہ چپکا رہا۔ اور اپنا کام کئے گیا۔

لامذہب کبھی جھوٹ نہیں بولتا تھا۔ شراب سے اسکو نفرت تھی
زنا اور جوے کا کبھی اس نے ارادہ بھی نہیں کیا۔ دغا فریب۔
غیبت چوری۔ کے گناہ اس نے دانستہ کیا نا دانستہ بھی نہیں کیئے
اپنی روزی محنت سے کماتا تھا اور بڑی بے فکری اور آزادی
کی خوش باش زندگی بسر کرتا تھا۔

اس کی زندگی کا پروگرام یہ تھا۔ صبح طلوع آفتاب سے پہلے
بیدار ہوتا ورزش کرتا غسل کرکے دودھ پیتا۔ پھر ہوا خوری کو نکل جاتا
واپس آکر کالج کے سبق کی کتاب دیکھتا۔ کیونکہ وہ ایک کالج کا پروفیسر
تھا۔ دس بجے کھانا کھا کر کالج جاتا چار بجے واپس آکر کچھ ناشتہ کرتا اور
ٹینس کھیلنے ایک کلب میں چلا جاتا وہیں اسکے ہم خیال احباب ملتے
جن سے سورج چھپنے کے وقت تک خوش گپی رہتی پھر گھر آتا کھانا
کھا کر کتاب دیکھتا۔ اخبار پڑھتا۔ اور پاؤں پھیلا کر آرام سے سو رہتا
اسکو نماز وا ا کی پابندی جبل نظر آتی تھی۔ وہ کہتا تھا وقت کی پابندی
کام کے لئے ضروری ہے۔ اس کام کی کیا ضرورت ہے جس کا نتیجہ
کچھ نہیں خواہ مخواہ وقت ضائع کیا جاتا ہے۔

وہ بہت فیاض تھا۔ اکثر اپنے حصہ کا کھانا کوئی بیکس محتاج سامنے
آجاتا تو اس کو دیدیتا تھا مگر روزہ پر اس کو حیرت تھی کہ خلقت بھوکی

کیوں مرتی ہے۔

اُس کی آمدنی اتنی تھی کہ ذاتی ضروریات سے روپیہ بچ رہتے تھے۔ اُن کو وہ طالب علموں یا اورغریبوں میں تقسیم کردیتا تھا مگر زکوٰۃ کے ٹیکس کو وہ فضول سمجھتا تھا کیونکہ اس کو مذہبی قواعد کے ماتحت رہ کر خیرات کرنے سے چڑ تھی۔

لامذہب پروفیسر میں ایک متقی مسلمان کے اوصاف سب موجود تھے۔ سوائے اس کے کہ اس کا عقیدہ مذہب اور اس کے خدا پر نہ تھا۔ اس کا خیال تھا خدا کوئی چیز نہیں ہے۔ فطرت کے تقاضے سے چیزیں پیدا ہوتی ہیں اور شکل بدل کر مٹ جاتی ہیں۔ اگرچہ وہ مسلمانی مذہب کا منکر تھا مگر مسلمان قوم پر اس کی جان فدا تھی۔ کیا مجال کہ مسلمانوں کی کہیں توہین ہوتی ہو اور وہ برداشت کرلے مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ وہ سرحدی جوان تھا۔ ہاتھ پاؤں خوب مضبوط تھے دس پانچ کیا سو پچاس آدمیوں کی ہیبت اس پر ذرہ کے برابر بھی اثر نہ کرتی تھی۔

لامذہب پروفیسر کو شادی کی رسمیں معلوم کرنے کا بڑا شوق تھا ہر قوم کی رسومات شادی سنتا موقع بنتا تو خود جا کر دیکھتا کوئی کتاب ایسی ملتی تو بار بار پڑھتا۔ اور ہر اہم کو یاد کر کے لوگوں کو سناتا۔

یہ سُن چکے ہو کہ لامذہب پروفیسر بہت توانا اور تندرست نوجوان تھا پاکبازی کے سبب اسکی صحت جسمانی بہت اچھی حالت پر قائم تھی اور وہ یقین کرتا تھا کہ طبعی عمر سے پہلے اس کو موت نہیں آئے گی۔ یہ یقین اہل مذہب کے ایمان کی طرح مضبوط تھا۔ اور کوئی چیز اس کے خیال عقلی کو بدلنے والی موجود نہ تھی۔

لیکن یکایک وہ بیمار ہوا۔ اور ایسا کہ باوجود جسمی قوت کے بستر سے اُٹھنا دوبھر ہوگیا۔ اس کے دوستوں نے ڈاکٹروں کا جم غفیر جمع کر دیا جنہوں نے بہت توجہ سے پہلے اس کے مرض کی تشخیص کی۔ اور پھر علاج شروع کیا۔ ڈاکٹروں نے مرض کے جو اسباب تجویز کئے ان کو پروفیسر نے تسلیم کیا اور اُسے خوشی ہوئی کہ ڈاکٹر ٹھیک راستے پر پہنچے ہیں اور اب مرض کے دفعیہ میں اُنکی کامیابی یقینی ہے۔ ڈاکٹروں نے جو کچھ دوا بتائی اُس نے ٹھیک اصول کے موافق اُن کو استعمال کیا اور پرہیز بھی ایسا کیا جو پرہیز کا حق تھا۔ یعنی ڈاکٹری مشورہ سے ایک انچھ ادھر اُدھر نہ ہوا۔

مگر پروفیسر حیران تھا کہ دوا اثر کیوں نہیں کرتی مرض بڑھتا چلا جاتا ہے اور کوئی تدبیر اس کو روک نہیں سکتی۔ اس نے بار بار ڈاکٹر تبدیل کرائے لیکن کسی سے مرض کی روک تھام نہ ہو سکی۔

وہ یونانی علاج کا قائل نہ تھا مگر مجبور ہو کر چند اچھے طبیب بھی بلائے ان کی تجویز بھی ڈاکٹروں کے موافق ہوئی مگر دوا پی تو اس کا اثر یہاں بھی ندارد آخر ڈاکٹروں اور طبیبوں نے جواب دیدیا احباب کو نہیں خود پروفیسر کو کیونکہ وہ جانتے تھے کہ پروفیسر ڈرنیوالا آدمی نہیں ہے

پروفیسر نے اس فیصلہ کو بہت اطمینان سے سنا اسکی نسل موت سے کبھی نہیں ڈرتی کیونکہ عقل و فلسفہ سے اس کے دماغ کی پرورش ہوئی تھی اور وہ موت کو زندگی کا ایک لازمی اور ضروری حصہ سمجھتا تھا۔ اس واسطے اس نے ڈاکٹری رائے کی کچھ پروانہ کی۔ اور اطلاع مرگ سے ہوش باطنی اور حواس ظاہری کو پراگندہ نہ ہونے دیا۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ پروفیسر کے اعصاب دل و دماغ ہی نے اس خبر کو زیادہ اہم نہیں سمجھا تھا۔

مگر اسکے ساتھ ہی وہ اپنے قوائے حفظ ما تقدم پر بار بار زور ڈالتا تھا اور سوچتا تھا کہ میرا مرض ان امراض میں نہیں ہے جن کا علاج ڈاکٹروں کو معلوم نہیں معمولی بیماری ہے جسکی حقیقت سے اور اسکی دوا سے میں خود اناڑی آدمی تک واقف ہوں پھر کیا وجہ ہے جو دوا اپنا اثر نہیں کرتی۔ مجھے آخر دم تک تدابیر اور کوشش سے غافل نہ ہونا چاہیئے۔ ڈاکٹروں کا فیصلہ نیچر کا فیصلہ نہیں ہے آدمی کی رائے

میں غلطی کا امکان موجود ہے۔ ہوسکتا ہے کہ بشریت سے بڑا کٹروں
کی عقل پر پردہ پڑ گیا ہو۔

یہ خیال کرتے ہی اس کے دل کو ایک ہلکا سا لگا۔ اس کا ضمیر
خود بخود نادم سا ہو گیا۔ کیونکہ اس خیال کی لہر کے ساتھ دوسرے گوشہ
خیال سے یہ موج پیدا ہوئی تھی کہ اسی طرح خدا کے وجود کو نہ ماننے
میں ممکن ہے میری بشری بھول ہو اور مرض کو لاعلاج خدا ہی نے کر دیا ہو
تاکہ وہ میرے انکار مذہب کو زک پہنچائے۔ اس خیالی جنبش نے پروفیسر کو
کچھ گھبرا سا دیا۔ اسکے چہرہ پر پسینہ آگیا۔ دل کی حرکت تیز ہو گئی مگر فوراً
ایک تیسرے خیال نے اسکے اوسان درست کر دیے جو یہ تھا۔

ہر انسان میں قدرتی طور پر لیاقت اور نالائقی۔ قوت اور کمزوری
ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ اگر علم و تربیت سے لیاقت اور طاقت کو سہارا ملا
تو وہ نالائقی اور کمزوری پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ ورنہ انسان پر غلبہ
نالائقی اور کمزوری کا ہو جاتا ہے۔ چونکہ میری تعلیم و تربیت اچھی ہوئی ہے
میں اپنی کمزوریوں پر غالب تھا۔ مگر اب بیماری کے سبب اعضاے
دماغی ناتوان ہو گئے ہیں اسواسطے عقیدہ کی کمزوری اُبھرتی ہے
اور مجھکو خدا اور مذہب کی حقانیت کا وہم دلاتی ہے۔ پس مجھے بچنا ہونا چاہئے
اور دنیا سے چلتے وقت ایسی بے عقلی کی حرکت سے اپنے کیریکٹر کو گندہ

نہ کرنا چاہیئے۔

اس خیالی موج نے پروفیسر کے بحر قلب کا وہ بلبلا توڑ ڈالا جسمیں ابھی ساری عمر کے بعد تصور خدا کی ہوا سمائی تھی۔ اور وہ ہمہ تن صاف سینہ ہو کر پھر اپنے مرض پر غور کرنے لگا۔

سکرات کا آلارم

افسوس اجل نے پروفیسر کو مزید غور و فکر کی مہلت نہ دی اور اپنی آمد کا گھنٹہ بجانا شروع کر دیا۔

پروفیسر نے بہت کم موت کا فلسفہ پڑھا تھا۔ کیونکہ وہ ابھی جوان تھا اور اس وقت کی تیاری کو ضروری نہ سمجھتا تھا۔ نہ اس نے اور لوگوں کے مرنے میں کبھی شرکت کی تھی۔ جو مرنے کی حالت سے واقف ہوتا اس واسطے موت کی آمد کا اصلی نشان اس کو معلوم نہ تھا تاہم وقت آخر کی جسمانی کوفت سے اس نے سمجھا کہ یہ کیفیت مرض کی تکلیف سے کچھ الگ سی ہے۔ شاید کچھ پیش آنیوالا ہے۔ ممکن ہے ڈاکٹروں کی رائے کے موافق موت آئی ہو۔ اگر موت آتی ہے تو اور اگر مذہب والے سچے ہیں۔ اور اگر موت کے وقت فرشتے آیا کرتے ہیں تو وہ کہاں ہیں مجھے تو کچھ نظر نہیں آتا۔ یہ سب فرضی کہانیاں تھیں۔ یا شاید مجھے

موت ہی نہ آئی ہو۔ موت نہیں آئی تو فرشتے کیونکر آسکتے۔

پروفیسر اپنے خیال پر جھنجلایا کہ گھڑی گھڑی خدا و مذہب کا دھیان
کیوں آتا ہے۔ موت آئی ہے تو میں خوشی سے زندگی دینے کو تیار
ہوں پر احمق پن کے خیالات میں جان کیوں دوں۔

اِسی کشمکش میں تلوؤں میں کسی نے بجلی کی مشین لگا دی۔ جس سے
بدن کے پٹھے اکڑنے لگے اور پروفیسر کو سخت تکلیف ہونے لگی۔ وہ
تڑپنا چاہتا تھا مگر تڑپ نہ سکتا تھا۔ وہ چیخنا چاہتا تھا مگر اسکی آواز نہ نکلتی
تھی۔ وہ پیروں کے سمٹنے کی خواہش میں تمام جسم کی قوت خرچ کر رہا
تھا مگر پاؤں ہلتے تک نہ تھے۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ پاؤں سامنے پھیلے
ہوئے ہیں لیکن اسکے ارادہ سے اوپر کو نہیں سمٹتے۔ زبان کا حس
معلوم ہوتا تھا کہ وہ منہ کے اندر موجود ہے مگر وہ بولنے سے گویا انکار
کرتی تھی۔ پروفیسر نے اس بے اختیاری سے ہراساں ہوکر پلنگ
کے آس پاس اپنے احباب کو دیکھا لیکن کسی دوست نے اس کے
مطلب کو نہ سمجھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی فریاد اُن سے کرے۔ کسی کی
مخالفت بھی نہ تھی۔ کوئی رد کرنے والا نہ تھا مگر زبان پر قفل لگ گیا تھا
اور اسی بات سے پروفیسر زیادہ کھسیانا اور مایوس تھا۔

بجلی کی مشین موجود نہ تھی مگر پروفیسر کو معلوم ایسا ہوتا تھا کہ اس کے



[illegible]ی ہوئی ہے جو اسکی رگوں اور پٹھوں کو کھینچ کھینچ کر توڑے [illegible] ہو اسے معلوم ہوا کہ دماغ نشتر سے چیرا جاتا ہے اور میں دماغ کے اندر آباد ہوں۔ اس واسطے اس نے پھر کوشش کی۔ اور پکار پکار کر کہنا شروع کیا اس گھر کے اندر میں ہوں۔ اس کو نہ توڑنا۔ اس کو نہ چیرنا۔ مگر اسکی چیخ پکار سے اس کو تسلی نہ ہوئی۔ اس واسطے اس نے خیال کیا کہ میری آواز شاید کسی نے بھی نہیں سنی۔ ہائے میں کیسا بے کس ہو گیا ہوں۔

اب اسے معلوم ہوا کہ میں شاید ہزاروں کوس اونچے مینار سے نیچے گر رہا ہوں۔ اور نیچے گرتے وقت کلیجہ میں جو ایک سنّاٹا سا ہوتا ہے اس کا حس پروفیسر کو بہت تیزی سے محسوس ہونے لگا۔

پھر معلوم ہوا کہ دل میں ایک دریا ہے میں مینار پر سے اسکے اندر گر پڑا بہت دیر تک تو دریا کی تہ میں ڈبکیاں کھاتا رہا آخر اوپر ابھرا۔ اور پانی سے گردن باہر نکالی۔

گردن نکلی تھی کہ اسکو یہ معلوم ہوا کہ میں نے خواب دیکھا ہے پلنگ پر لیٹا تھا۔ دوست چاروں طرف بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر آلہ سے دل کی حرکت دیکھ رہا تھا۔ پروفیسر نے ڈاکٹر سے کہا کہ دنیا میں کوئی ایسی چیز ہے جو میری زندگی کو موت کے ہاتھ سے بچا لے۔ ڈاکٹر کوئی خدا پرست آدمی تھا

بولا سوائے خدا کے کسی میں یہ طاقت نہیں۔

پروفیسر اس چیز کا نام مت لو کیا ایسے عقل اور سائنس کے زمانہ میں۔ انسان جیسی ہستی موت کو روکنے سے عاجز ہے تو کیا تاریک اور وحشی زمانہ کا خدا اس وقت میں بھی ہم لوگوں پر کچھ اقتدار رکھتا ہے۔

یورپ و امریکہ نے بڑی بھول کی جو اسباب حیات کے لئے آلات سازی میں مصروف ہو گئے آسایش جسمانی کی ترقیوں کیلئے انھوں نے اپنی عقلوں کو خرچ کیا۔ کاش وہ سب کے سب موت کی حقیقت معلوم کرتے۔ کاش وہ اتنا سمجھ لیتے کہ تھوڑی دیر کے واسطے موت کیونکر رک سکتی ہے۔ آہ میں زندہ رہ سکوں تو ساری زندگی اسی دریافت میں خرچ کر دوں گا۔ ارے کوئی تو ایسا آئے جو مجھے اس وقت مرنے نہ دے۔ کوئی تدبیر تو ایسی نکالو کہ موت مجکو مہلت دیدے۔

ہائے یہ کیموڑ کے درخت کیسے زندگی میں آزاد کھڑے ہیں اور میں انکا [illegible] جان دے رہا ہوں۔ یہ میری کرسیاں موجود رہیں اور میرا وجود فنا ہو جائے اس بنگلہ کی چھت بھی میرا ساتھ نہیں دیتی۔ زندگی میں یہ مجکو دھوپ اور بارش سے بچاتی تھی۔ میری کتابیں الماری میں خاموش رکھی ہیں وہ بھی کچھ نہیں بولتیں۔

میں آدمی ہوں عقل کا پتلا ہوں۔ کیا ایسی عاجزی اور لاچاری کا وقت بھی پیش آنے والا تھا جس کا علاج میرے پاس نہیں۔

یہ کہتے کہتے پھر بجلی اسکے پیروں میں لگائی گئی۔ اور پہلی سی تکلیف اسکو ہونے لگی۔

اب اس نے فیصلہ کر لیا کہ جتنی ایام کے خدا سے مدد مانگوں گا۔ اسکا اقرار کروں گا۔ بیشک وہ ہے اسکے خیال کرنے سے مجکو تسلی ہوتی ہے۔ مجھے حضرت علیؑ کا قول یاد ہے کہ اگر موت کے بعد کچھ نہیں ہے تو خدا پرست اور منکرین خدا کی یکساں حالت ہے اور اگر کوئی دوسرا عالم مرنے کے بعد ہے تو خدا پرست فائدے میں ہیں اور منکر گھاٹے میں۔ بیشک علیؑ کا فلسفہ سچا ہے خدا کے اقرار میں لذت ہے اور اسکے انکار میں بیکسی و مایوسی وہ ضرور موجود ہے۔ نہ ہوتا تو انسان اس وقت مجبور کا چارہ کار ضرور پیدا کر لیتا وہی نہیں کرنے دیتا۔ اُسی نے دواؤں کو بے اثر کر دیا۔ وہی عقل کو مغلوب کر رہا ہے۔

اے خدا تو جہاں ہے میری سُن میں بجکو تسلیم کرتا ہوں میں تیرا اقرار کرتا ہوں میں اپنے نام محمد ظریف کے پہلے حصہ کی بھی تصدیق کرتا ہوں۔ محمدؐ تیرا فرستادہ تھا۔ میری عقل کا سلام اُس کو پہنچا۔ اور اس بیچینی میں میرا سہارا بن موت سے بچا لے۔ یا اسکی دشواری کو آسان کر۔

یہ کہتے ہی پروفیسر کے بدن میں سنسناہٹ ہونے لگی - تکلیف جاتی رہی اور ایک طرح کی لذت کا اثر اسکو محسوس ہوا جسم کے رونگٹوں سے کوئی چیز نکلتی معلوم ہوئی - آنکھوں پر نیند کا سا غلبہ ہوا - اور ایک ہچکولا ایسا لگا کہ پروفیسر نیند سے چونکتا سا رہ گیا اور پھر اسے خبر نہ ہوئی کہ وہ کہاں ہے - کیسا ہے - کیا تھا کہاں تھا - اور اب کہاں چلا گیا -

---

جناب مولانا راشد الخیری عم ادا دہلی کے مشہور انشا پرداز ہیں زنانہ رسالہ عصمت کے ایڈیٹر اور متعدد زنانہ کتب کے مصنف ہیں - انکی عبارت ایک مخصوص رنگ کی ہوتی ہے خصوصاً مضامین غم لکھنے میں انکو کمال حاصل ہے - شمس العلماء مولانا نذیر احمد دہلوی سے ان کی قریبی رشتہ داری ہے مگر ادب اردو میں انہوں نے مولانا مرحوم سے جداگانہ ایک شاخ ایجاد کی ہے -

مجھے رسالہ کم ٹو موت لکھتے وقت خیال آیا کہ مولانا ممدوح کے چند مضامین بھی اس کتاب میں شریک کئے جائیں - مگر وہ میری طرح لکھنے کے شوقین نہیں بہت کم لکھتے ہیں اور بہت تقاضوں سے لکھتے ہیں امیدوار ہوں کہ انہوں نے میری درخواست رد نہیں کی اور اس رسالہ کم ٹو موت کے لئے چند مضامین بہت جلدی تیار کر کے دیدئے جو ناظرین کی خدمت میں حاضر کئے جاتے ہیں جن کے پڑھنے سے معلوم ہو جائیگا کہ مولانا ممدوح نے ہر مضمون میں موت کا وقت مجسم کر کے

کھڑا کر دیا ہے اور ان میں انکی اسابرداری کے لاجواب کمالات کا دریا بہتا نظر آتا ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ رسالہ کم ٹو موت کا مقصد اس حدید اضافہ سے دوگنا روشن ہو گیا اور اہل ملک نے مختلف طبقوں کے وقت آخر کو الفاظ کے نقشہ میں سامنے موجود دیکھ لیا اور یہی وہ چیز ہے جسکی خاطر میں نے یہ رسالہ مرتب کیا ہے۔

حسن نظامی

اکلوتہ کی موت

زندگی ہستی تھی اسرائیلی خاندان کے اُن چند افراد پر جن کو موت سے کدورت نفرت عداوت خدا معلوم کیا تھا کہ مری ہوئی چیونٹی تک کا ذکر گھر میں نہ آسکتا تھا۔ عورتیں تو خیر جاہل کم عقل وہمن جو کچھ بھی تھیں مگر رونا ان کمبخت مردوں کا ہے پڑھے لکھے سمجھدار دور اندیش اور پھر یہ بھی نہیں کہ سب نو عمر جوان دو برس کے بچہ سے لیکر پینسٹھ برس تک کے بڈھے کھوسٹ موجود مگر کیا مجال جو بڑوں تک میں موت کا نام آجائے۔ عورتوں نے تو خیر یہی انتظام کیا تھا کہ اگر کسی ماما نے مرا ہوا چوہا دیکھ لیا تو تین دن گھر میں قدم نہ رکھے مگر مرد بھی عورتوں سے کسی طرح پیچھے نہ تھے نواب لی محمد خاں کا تعلقہ کچھ نہیں تو ایک چھ ہزار روپیہ ماہوار کا ہو گا خدا

جھوٹ نہ بلائے منشی محرر کارندے خزانچی نوکر چاکر یہ ہ سب ملا کر کوئی سو آدمیوں کا عملہ تھا مگر کسی کی اتنی ہمت نہ تھی کہ موت کا نام لے سکتا اپنا ملازم ادہر نام لکھا گیا اور ادہر اس خاص داروغہ نے جو اسی کام کی تنخواہ پاتا تھا صاف صاف کہدیا کہ دنیا بھر کے قصور کیجیو مگر موت کا نام کبھی نہ لیجیو اسد ضرورت ہو تو موت کو پیدائش کہدینا جائز ہے مگر یہ نام جس کی زبان سے نکلا اس کا پھر ٹھکانا نہیں ولی محمد بیوقوف شخص نہ تھا قومی کاموں میں اس کے چندے مہمانوں کی خاطر مدارات حاجتمندوں سے اسکی ہمدردی عام طور پر مشہور تھی مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ موت سے اسے ایسی کیا دشمنی تھی کہ اگر اس کا بس چلتا تو ملک الموت کو کچا کھا جاتا دشمنی بھی نہیں اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ قدرت کی تمام کائنات بیگناہ قیدیوں کی حراست دکھیاری رانڈوں کا زمانہ ہوگی سکس یا ہجوں کا عرصہ حیات ہر چیز دنیا میں قائم رہے مگر موت کا وجود نہ رہے

اتفاق سے نواب ضمیر الدولہ بہادر شکار کی غرض سے تشریف لائے ولی محمد کے قدیمی دوست تھے جی کھول کر خاطر مدارات کی ناچ رنگ کھیل کود ہیجڑے بھانڈ رنڈیاں میراسنیں کوئی فرحت ظاہری ایسی نہ تھی جو نظر انداز کی گئی ہو ولی محمد خاں ایک روز

محلسرا میں تھے اور ضمیر الدولہ بہادر بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے کہ وزیر ایک نیا نوکر جس کو آئے دو دن بھی نہ ہوئے تھے اور آقا کی صورت تک نہ دیکھی تھی دفعتہً گھبرایا ہوا آیا اور ضمیر الدولہ کے سامنے کھڑا ہو گیا ہانپ رہا تھا آنکھ میں آنسو تھے دل کا اللہ مالک تھا۔

ضمیر الدولہ۔ کیا ہے ؟

وزیر۔ حضور! کیا عرض کروں! والد پیدا ہو گئے۔

ضمیر الدولہ۔ تمہارے ہاں والد پیدا ہوئے ، کب ؟

وزیر رو کر۔ سرکار ابھی تھوڑی سی دیر ہوئی۔

ضمیر الدولہ۔ والدہ بھی پیدا ہو ئیں یا ابھی نہیں۔

وزیر۔ اجی سرکار والدہ کو پیدا ہوئے تو چار برس ہوئے۔

ضمیر الدولہ۔ تو اب چار برس کی ہیں اور تمہارے ہاں کون کون پیدا ہو چکا ہے۔

وزیر۔ غریب پرور کس کس کو گنواؤں ، دو بھائی پیدا ہوئے تین بہنیں پیدا ہوئیں اب ایک میں رہ گیا ہوں سو اب میں بھی صبح شام میں پیدا ہونے والا ہوں۔

ضمیر الدولہ۔ پیدا ہوتے ہی گوند کھانے بھی اڑاؤ گے یا نہیں

وزیر واہ سرکار کسی کے ہاں پیدائش ہو اور آپ مذاق اڑائیں

ضمیر الدولہ۔ تو کیا پیدائش رونے کا وقت ہے
ضمیر الدولہ بہادر نے اتنی دیر مغز مارا اور خاک نہ سمجھ سکے کہ وزیر کا
مطلب ہے کیا۔ اتنے ہی میں ولی محمد خاں بھی آ گئے سنتے ہی
تیوری پر بل آ گیا چہرہ بدل گیا کہا ہے کیوں ایسے لوگ نوکر رکھے
جاتے ہیں جنکو ایسی ضرورتیں پیش آئیں بلاؤ داروغہ کو بیوقوف
کچھ نہیں سمجھتا کیوں نہیں پہلے سے اچھی طرح دیکھ لیتا سخت تکلیف
ہوئی حد سے زیادہ از بس نامعقول نالایق چلو ہٹو سامنے سے
بھاگ جاؤ پھر کبھی مت آؤ۔
نواب ولی محمد خاں کی عمر کا سہرا اور بیگم صاحب کی [illegible]
ایک پانچ برس کا بچہ تھا جو پیدا ہوتے ہی باپ بن چکا تھا اور پیدا
نام تھا ابوالعلا نواب ظہیر بھی حال یہ بچہ ماں کی طرف سے جا بجا
ہیں اور باپ کی طرف سے پانچ بھائیوں میں صرف ایک [illegible]
سچ مچ کی نعمت تھا کہ جس خاندان میں چالیس سال تک بچہ کا
بچہ نہ دکھائی دے وہاں ابوالعلا جو کچھ نہ ہوتا تھوڑا تھا۔ آیا بن کا
بچہ فقیر کا نہیں عرب کا نہیں [illegible] والا سکا آنکھ کا
تارا تھا کہ دو خالائیں اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر بن کر [illegible] دور آ
آندھی ہو یا مینہ صبح اسکے واسطے آئیں اور شام کو جاتیں پڑی تو

اسکے کارن میاں کو بھی چھوڑ بیٹھی دن رات بچہ تھا اور وہ تھی لاڈلے
اور ملاخی ضدی اور مرت بیا ہی سب ہی قسم کے سیّے دیکھے مگر یہ
رنگ دیکھا نہ سنا کہ بچہ خاصا اچھا بھلا جیتا جاگتا پڑا سو رہا ہے اور اکثر ما
اور خالائیں کبھی کبھی باپ اور چچا بھی اسکے پاس بیٹھے اسکا چہرہ
دیکھ رہے ہیں کوئی ناک کی تعریف کر رہا ہے کوئی آنکھ کی کسی نے
ہاتھ سہلانے شروع کیے کسی نے پاؤں۔ ادھر بچہ نے آنکھ کھولی
ادھر چاروں طرف سے انّاؤں ماماؤں کی تو ماری بھی نہ آئی
ما اور خالہ باپ چچا بھتیا بانہ پیکے کسی نے گود میں اٹھا لیا کسی نے
ہاتھ سہلانے کسی نے پاؤں۔

پانچ برس کے بعد پانچ چھ برس اور آنکھ بند کر کے گزر گئے ظہیر
کی عمر اب گیارہ برس کے قریب تھی خاندان کے ہر شخص کی آنکھیں
اسپر لگی ہوئی تھیں اور زندگی کا یہ عاشق خاندان جو بھول کر بھی موت
کا خیال نہ کرتا تھا اپنی عمر میں دن عید رات شبرات بسر کر رہا تھا
بارہویں سالگرہ قریب آئی تو دھوم دھام کی شادی تجویز ہوئی دور
دور سے مہمان آنے شروع ہوئے ہزاروں من کھانا تیار ہوا محلسرا
اور دیوان خانہ ایسا سجا کہ جسم سے بول اٹھا مشہور گویوں اور حسین
طائفوں کا تار بندھ گیا سات دن کی مہمانداری اور کھانے کو عام دعوت

تھی مگر کھانے والوں کا طبقہ خاص تھا یہ نہیں کہ غریب غربا لنگڑے
لولے جسکا جی چاہے دستر خوان پر جا بیٹھے پانچویں دن سلامی
تھی جسمیں لڑکا دولہا بنکر سارے شہر میں پھرتا اور بڑی بوڑھی جان
کے سلام کو جاتا پھولوں کا گہنا اس طرح پیارا ہوا کہ اڑوس پڑوس کے
تمام باغ خالی ہو گئے دولہا سلامی کو چڑھا تو اسکے جلو میں بیسیوں
ہاتھی سیکڑوں گھوڑے ہزاروں چوبدار حاضر تھے ولی محمد خاں اپنے
تزک و احتشام کو دیکھ کر پھولے نہ سماتے تھے اور بچہ کو دیکھ دیکھ کر
باچھیں کھلی جاتی تھیں انکی نگاہ میں اسوقت دنیا و ما فیہا ہر شے
ہیچ تھی اور انکا خیال بادی النظر میں غلط بھی نہ تھا دولت اعزاز
صحت بیفکری کونسی نعمت تھی جو میسر نہ تھی رنج انکے خیال میں
بھی نہ پھٹک سکتا تھا اور تکلیف اسکے ذہن میں بھی نہ آ سکتی تھی دولہا
گھوڑے سے اتر سلام کو گیا گیارہ ہزار روپیہ سلامی کی نقارہ پر چوٹ
لگی ولی محمد خاں کو پان کا بیڑا ملا وہ ہشاش بشاش تو کر چاکر اچھلتے
کودتے عزیز اقارب شاداں فرحاں گھر چلے آدھی دور رستہ طے کیا
ہو گا ایک بڑھیا عورت نواب ولی محمد خاں کے سامنے آئی اور کہا
نواب! تیرے دولہا کی عمر دراز، تین وقت کی بھوکی ہوں
اس مالک کے نام پر جسنے یہ دن دکھایا، دکھیاری کا پیٹ بھر دو

تیرا لال جئے، ہزاری عمر، مجھ پر بھی رحم کر،
ہٹ بہرے، آگے بڑھ، ہٹ ت، چل رستہ دے، ہتھیا دینے
نکلی ہے، بھاگ۔
اہماما، اچھا، خفا نہ ہو، غلطی کی، معاف کر۔
صبح علی الصباح ظہیر کو دولہا بنانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں نہیں بھاوجیں
بہو بیٹیاں بیگ پر اڑی ہوئی تھیں آج شادی کا آخری روز اور جشن
سالگرہ کا خاتمہ تھا دودھ سے غسل دیا گیا عطر کے کنستر لنڈھا دئے گئے زینت
کی اچکن کا پہلا بٹن سوئی لگا رہی تھیں کہ موذن نے صبح کے سہانے
وقت میں دنیا والوں کو ایک زبردست طاقت والے کا پیام پہنچایا
پرندا اسکی عظمت کا ذکر سنتے ہی تسبیح میں مصروف ہوگئے درخت جھوم
جھوم کر نعرہ توحید لگانے لگے مگر غفلت کا پردہ تھا تو انسان اور اسکی
عمارات پر موذن کا جھنجوڑنا بیکار چڑیوں کی حمد بے سود اور درختوں کا سجدہ
فضول تھا وہی رنگ رلیاں اور وہی چہل پہل صبح ختم ہوئی وقت
گذر گیا زرو جواہر دولہا پر نچھاور ہو کر عزیزوں کو نیگ ملے نوکروں کو
انعام بچہ ماں کے سلام کو آرہا تھا کہ طبیعت سنے مالش کی قے ہوئی دست
آئے اور اس غضب کے کہ دو کی گنتی تھی نہ چار کی تار بندھ گیا دوپہر
تک تو نڈھال ہو کر پلنگ سے اٹھنے کے قابل نہ تھا دلی محمد خاں

بیگم صاحب خالائیں چچا سب پریشان ہو گئے ڈاکٹر بھی آئے حکیم بھی ملا بھی اور سیانے بھی مگر ظہیر کی حالت نہ سنبھلنی تھی نہ سنبھلی موت کے آثار تمام جسم پر ظاہر ہو گئے ناخن نیلے ہو گئے آنکھیں پتھرا گئیں اور جس چہرہ کو دیکھ دیکھ کر ماں باپ ہمیشہ ناز کرتے تھے چشم زدن میں اس پر مردنی چھا گئی شادی کا گھر موت کی محفل ہو گیا چاروں طرف لوگ خاموش سناٹے میں بیٹھے تھے کہ بچہ گھبرا کر اٹھا برابر میں ماں بھی بیتاب ہو کر اسکی گردن میں ہاتھ ڈالکر کہا

امّاں جان! اب تکلیف نہیں اٹھائی جاتی ہڈی ہڈی ٹوٹ گئی پسلیاں نکلی پڑتی ہیں دعا کرو کہ موت اس تکلیف کو ختم کرے۔

نوج لوج خدانخواستہ خدانخواستہ دشمن دشمن

ایک شدت آواز گونجی مگر ماں کا کلیجہ سمجھ گئی اس تکلیف سے نکل پڑا وہ فرط محبت میں لپٹ گئی سر پر منہ رکھ دیا باپ کی آنکھ سے آنسو کی جھڑیاں بہہ رہی تھیں غمناک آنکھیں اسکی صورت کو دیکھتی تھیں اور روتی تھیں اب اللہ ولی محمد کو یہ خیال آیا کہ اگر موت اس لال کو مجھ سے جدا کر گئی تو کیا کروں۔ اس خیال کے آتے ہی بے اختیار ہو گیا اور جوش محبت میں اسکے ہاتھ اٹھا کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیئے اس وقت ظہیر بیہوش ہو چکا تھا اور ہیضہ کی آخری منزل شروع تھا خالائیں سر پیٹ رہی تھیں

چچا دیواروں سے ٹکریں مار رہے تھے ماں گم سم اور باپ ساکت تھا دونو کی آنکھیں اس بارہ سال کے مہمان بچہ پر لگی ہوئی تھیں جسکو اپنا سب کچھ سمجھتے تھے۔ وہ گھر کی ملکیت تھا جسکے نام سے گھبراتے تھے وہ آسودہ حال اٹل اور جس کا نام تک لینا گوارا نہ تھا اسکی طاقت لازوال تھی۔

دفعتہً ظہیر نے آنکھ کھولی پھول سا چہرہ کمہلا چکا تھا زبان اور ہونٹ خشک تھے ہاتھ پاؤں کی طاقت سلب ہو چکی تھی اور جس پر ہزاروں روپیہ حالی خوشیوں کے واسطے قربان ہو رہا تھا وہ پانی کے ایک گھونٹ کا محتاج ہو رہا تھا۔ ہکلاتی زبان سے کہا مگر موت میں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی جو کب نہ سمجھ سکے اس وقت ظہیر نے حسرت بھری نظروں سے ماں کو دیکھا آنسو بہہ رہے تھے زبان باہر نکال کر ماں کو دکھائی اور بہ مشکل ہاتھ اُٹھا کر جوڑے اور پانی مانگا ماں بیتاب ہو گئی اسکے ہاتھوں کو بوسہ دیا اسکے آنسو اپنے ہاتھ سے پونچھے کہا۔

"میں اپنے لال کے لئے پانی لائی"

ماں پانی لینے گئی مگر اسکے منہ موڑتے ہی ظہیر کو ہچکی آئی اور وہ پانی کو ترستا حسرت کو کچھ کرتا دنیا سے رخصت ہو گیا

ظہیر کی موت سے ان لوگوں کا کیا حشر ہوا ظاہر ہے دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی ماں اور باپ دو لوگ سر پھوڑ رہے تھے لیکن ظہیر کی موت آنکھ سے سبق دے گئی

ہر حالت میں تغیر اور ہر صورت میں انقلاب انسانی زندگی کا لازمہ ہے
موت سر پر کھڑی ہے زندگی کے فانی تعلقات کو آنا فانا ختم کر دیگی
تمول میں افلاس صحت میں علالت جوانی میں بڑھاپا اور زندگی میں
موت سے غافل ہونا شیوۂ انسانیت نہیں۔
اے انسان کس تنے پر پھولا اور کس ہستی پر پھولا تیری طاقت
ختم ہونے والی اور تیری زندگی مٹ جانے والی ابدی طاقت اور ازلی
زندگی اس ہی ایک ہستی کی ہے جو سب سے بہتر اور سب سے طاقتور ہے۔

پیر کی موت

رسی ہنی دیوتا اوتار، ولی ی پیر پیمبر، دنیا ان پاک نفوس سے کبھی خالی
نہ رہی اور جب تک ہے رہیگی بھی نہیں مسلمانوں کا عقیدہ ہے، کہ
پیغمبری ختم ہوگئی، یعنی وحی کا آنا بند ہوگیا مگر بعد آخر الزمان کے بعد وہ
نیک بندے یقیناً آتے رہے اور چلے گئے جو رسول تو نہ تھے مگر عاشق
رسول بلکہ فنافی الرسول، لیکن زندگی کے شیدا، لذتوں کے عاشق،
عیش کے دلدادہ، ان سے بہت بڑھے ہوئے تھے، وہ دس تھے تو یہ
دس لاکھ بلکہ دس کروڑ، خواہش زر کاروباری کا لازمی نتیجہ تھی حصول
مقاصد کا بہترین ذریعہ لباس فقر، نتیجہ یہ ہوا، اور کچھ غلط نہ ہوا کہ کھوٹے

اور کھرے بد اور نیک جھوٹے اور سچے بُرے اور اچھے خلط ملط ہو کر سب
ایک ہو گئے لیکن اٹھارہویں صدی کے وسط میں جلال شاہ خاک
حسین آباد سے ایک ایسا شخص اُٹھا جس نے دنیا کو دکھا دیا کہ شریعت اور
طریقت تصوف اور توحید عشق اور محبت مجازی اور حقیقی اگر نیت بخیر
اور ایمان سالم ہے تو سب ایک ہیں یہ پیچیدار گھاٹیاں خطرناک مسافت
کٹھن منزلیں فقط دیکھنے میں ٹیڑھی اور پیچیدہ ہی ہیں ورنہ منزل مقصود
ایک ہے اس سے آسان وہ اس سے بشرطیکہ عزم مصمم ہمت پوری
دل صاف اور خیال پاک ہو۔

شریعت اس سے انکار نہیں کر سکتی کہ ایک اس واحد کی کوشش
اور وہ کوشش جس میں کوئی ہاتھ بٹانے والا نہیں اسی کامیاب ہوئی
کہ آج صرف ہندوستان میں سات کروڑ کے قریب انسان اس کا
کلمہ پڑھ رہے ہیں یہ اس سے گریز ہو سکتا ہے کہ اب ہر صوبہ ہر شہر ہر گاؤں
مختصر یہ کہ ہر گھر میں ایک لیڈر بڑی بڑی مونچھوں والا لمبی ڈاڑھی
والا ماتھے پر گٹّے والا ڈھیلے ڈھالے کرتے والا موجود ہے مگر

آج کل وہ جنہیں اسلام کا دعویٰ ہے کمال — دیکھتا ہوں میں اسی ذوق پہ انکا احوال
جس طرح برکہ پھنسا دینے کو بے دینوں کے — نقل کرتا ہو مسلمانوں کی کافر افعال

بہر حال جلال شاہ وہ شخص تھا کہ مسلمان اس پر ہنستے اور وہ ان پر روتا

تعلیم یافتہ اس کا مضحکہ اڑاتے اور وہ ان کو دعا دیتا دوست دشمن
مرید الکتنی اسکی نگاہ میں سب ایک تھے بے نفس انسان اور بے پتہ کا
آدمی تھا کہ حاسد جل جل کر اور کڑھن کڑھن کر مجھ پر گالیاں دیتے بُرا بھلا کہتے
توہین کرتے تحقیر کرتے مرید ہنس ہنس کر اور کھل کھل کر ہاتھ چومتے پاؤں
چومتے خدمت کرتے اطاعت کرتے مگر نہ اس سے تیوری پر بل آیا نہ
اس سے چہرہ پر تارگی

جلال شاہ کے پیر مولانا معصوم اللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ قندھاری تھے ان کے
وصال کے بعد خلیفہ اول جلال شاہ ہوئے اور حق الامر یہ ہے کہ گو بہت سے
باکمال عقیدت مند مولانا کے موجود تھے اور خلافت کی اہلیت رکھتے تھے
مگر جلال شاہ کو کوئی نہ پوچھ سکتا تھا۔

شروع ہی سے جلال شاہ کو ظاہری ٹیپ ٹاپ اور تزک احتشام سے قطعی
نفرت تھی وہ نہ خلافت کے خواہشمند تھے نہ اختیارات کے بھوکے انہوں نے
صاف کہہ دیا کہ مجھ کو نہ اس مسند کی ضرورت ہے نہ اس طمطراق کی حاجت
خود ہی مرید ہوں دوسروں کو کیا مرید کروں گا ایک گوشہ میں بیٹھ کر
اللہ اللہ کرنا ہے دوگز زمین دیدو یہی زندہ کو کافی اور مردہ کو بہت
ہوگی مگر خود جلال شاہ کے ہمعصر مولانا کے شاگرد رشید اس پر رضامند
نہ ہوئے کہ جلال شاہ کہاں موجود گی میں پیر کی تسبیح اپنے گلے میں ڈال لیں

اس اصرار نے جلال شاہ کو مجبور کر دیا اور خانقاہ حسین آباد سے جلال شاہ کے فیض کا ایسا دریا بہا کہ مسلمان ہی نہیں دنیا سیراب ہو گئی۔

مریدوں کی تعداد تیس چالیس ہزار سے زیادہ ہو گی اور معمولی نہیں بڑے بڑے عالم زاہد امیر رئیس مگر سب کو یہ ہی ارمان رہا کہ کبھی کسی خدمت کا حکم ہو اور تعمیل کریں شاہ صاحب محروسے گھر بھا بیوی تھیں بچے تھے بیٹیاں تھیں بہویں تھیں دنیا کی ضرورتیں جیسی انسانی زندگی کے ساتھ ہوتی ہیں انکی بھی تھیں مگر دو موروثی کھیتوں کی پیداوار انکی آمدنی کا ذریعہ اور زندگی کی کل کائنات تھی سکڑوں ہزاروں روپیہ کی سوغاتیں مرید لاتے اور گھر میں پہنچاتے مگر انکو کانوں کان بھی خبر نہ ہوتی وہی ایک وقت جو کی روٹی اور دو مرچ کی چٹنی انکی غذا گاڑھے کا ایک کرتہ اور نیلا تہمد ان کا لباس ایک ٹوپی ایک مسواک ایک بوریا انکی جائداد تھی صبح کی نماز سے فرصت پاکر حجرہ میں چلے جاتے اور دوپہر تک اوراد و وظائف میں مصروف رہتے ظہر کے واسطے فقرائی مریدوں کا مجمع رہتا کا منتظر رہتا نماز کے بعد ان سے بات چیت کرتے اور عصر کے بعد کلام اللہ لیے بیٹھتے مغرب سے فرصت ہوئی تو گھر میں گئے عشا تک ٹھہرے پھر باہر آئے کتاب پڑھی اور جنگل میں نکل گئے اس وقت خاص خاص مرید ساتھ ہوتے اور فیض صحبت سے مستفیض ہوتے عام طور پر

لوگوں کو ساتھ چلنے کی اجازت نہ تھی گیتی کے دو چار گنے چنے آدمی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جنکی ایک نظر انسان کو پارس بنا دے۔

اسوۂ حسنہ جس کا حکم مسلمانوں کو کلام اللہ نے دیا اور جس کا اسلام مسلمانوں سے متوقع ہے شاہ صاحب کے ہر فعل سے ہر قول سے زندگی کے ہر شائبہ سے رفتار کی ہر جھلک سے گفتار کی ہر ادا سے ٹپک رہا تھا وہ بظاہر زندہ تھے چلتے تھے پھرتے تھے کھاتے تھے پیتے تھے اور دنیا کے تمام کام انجام دیتے تھے مگر فنافی الرسول تھے سونے میں اٹھنے میں بیٹھنے میں لیٹنے میں کھانے میں پینے میں کوئی لمحہ ایسا نہ تھا کہ انکی زبان اس ذکر سے خالی رہتی ہو بعض دنیا دار علماء نے جنکی دکانیں اچھی طرح نہ چلتی تھیں انکو مدعتی کا لقب مشرک کا خطاب کافر کا اعزاز عطا فرما دیا تھا اور بادی النظر میں ان بیچاروں کے یہ عذرات کچھ بیجا بھی نہ تھے دنیا بھر کے جتن کر ڈالے کتابیں لکھیں رسالے لکھے وعظ کہے تلقین کی انجمنیں تیار کیں مسجد مدرسے کنوئیں خانقاہیں سب ہی چیزوں کے بنوانے کا اعلان کیا حج کی تیاری کی تہجد خانوں کی ساڑھ ڈالی مگر وہ بات نصیب نہ ہوئی جب تک ایک بیوقوف بھی دنیا میں موجود ہے عقلمند بھوکا نہیں مر سکتا کامیاب مسرور ہوئے اور بہت سے بندگان خدا ان کے

ڈھنگ پر آ گئے لیکن جو بات شاہ صاحب کے ہاں تھی وہ نہ میسر ہوئی نہ ہو سکتی تھی باوجود اس کینہ و کاوش بغض و عداوت کے کہ مولوی آپ کے برخلاف ہمیشہ زہر اگلتے رہے انہوں نے کبھی ان میں سے کسی کے برخلاف ایک لفظ تک نہ کہا اور ان کے حق میں دعا خیر کی۔

مرید انکے عاشق زار تھے اور وہ دوسری دھن میں مست تھے علائق دنیوی اگر سنت رسول نہ ہوتے تو انکو بال بچوں کی بھی زیادہ پروا نہ تھی اور گو انکی طبیعت اس طرف کچھ زیادہ لگاؤ نہ رکھتی تھی مگر محبوب کا فعل تھا اور مطلوب کا ارشاد اس کو بھی سر آنکھوں پر رکھا۔ دس برس کی عمر سے پینسٹھ برس کی عمر تک تقریباً پچاس سال شاہ صاحب کی زندگی خلق اللہ کے واسطے اسلام کا ایک قابل تقلید نمونہ رہی اور اس عرصہ میں انہوں نے دکھا دیا کہ مسلمانوں کو کس طرح زندہ رہنا چاہئے اور خدا کی رضامندی کیونکر حاصل ہو سکتی ہے۔

آخر عمر رو بہ انحطاط ہوئی اور گو قوی ہیکل آدمی تھے اعصاب میں کسی قسم کا فتور یا طاقت جسمانی میں کوئی نقص نہ تھا مگر بڑھاپا شروع ہوتے ہی ضیق النفس کا مرض بری طرح ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا ابتدائی حالت میں تکلیف کو زیادہ محسوس نہ کیا استعمال میں فرق آنے نہ دیا مرض کی طرف توجہ ہوئی نہیں یہ لاپروائی شاہ صاحب کے واسطے اچھی نہ ہوئی اور اندر ہی اندر

بیماری ترقی کرتی گئی نوبت یہاں تک پہنچی کہ ایک نوالہ بھی حلق سے
اتر جاتا تو سانس کا لینا دوبھر ہو جاتا لا محالہ کھانے کی طرف رغبت بہت
کم رہی اور دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں صرف آدھ سیر چھوکا آٹا معمول
رہا مگر پھر بھی بھوک اضطراری تھی اور حیات انسانی کا لوازمہ عصر کو نہیں
عشا کو رات کو نہیں صبح کو لگتی اور مجبور دو چار نوالے جس طرح بھی ہوتا
کھاتے لیکن روٹی تیر کی طرح لگتی اور پانی چھریوں کی طرح گھستا سانس لینا
مصیبت ہو جاتا اور سینہ کی یہ کیفیت ہو جاتی گویا کوئی تیر جا تو سے
کھرچ رہا ہے ۔ یہ حالت شاید تین مہینہ تک رہی اور اب شاہ صاحب
کو اپنی زندگی سے قطعی مایوسی ہو گئی وہ مرنے کے واسطے ہر وقت تیار
تھے موت کو یقینی سمجھتے تھے اور جانتے تھے کہ اسکا کوئی وقت مقرر نہیں
یہ علم انسان کو نہیں دیا گیا مگر اس حالت نے اچھی طرح یقین دلا دیا
کہ اور چند روز کی ہوا کھا لوں وہ وقت قریب آگیا ہے کہ دنیا سے
رخصت ہو کر خدا کے حضور میں حاضر ہوں ۔

شاہ صاحب کی خبر علالت اور مرض الموت ایسی چیز نہ تھی کہ چھپی رہتی
اور ظاہر ہو جاتی تو معمولی بات ہو کر ختم ہو جاتی مریدوں کی تعداد اتنی
معقول شہرت اس قدر عام ہر دلعزیزی ایسی زیادہ حلق اسا اثر رہا ہوا اکیسا
یہ کچھ مرید کیا اور غیر مرید کیا ہر شخص شاہ صاحب کا عاشق تھا جن لوگوں نے

ایسی نفسانیت اور دنیا داری کی وجہ سے ہمیشہ عداوت رکھی وہ بھی ظاہر
نہیں تو دل میں انکی عظمت کے معترف اور خلوص کے مداح تھے۔

اب شاہ صاحب کو اٹھنا بیٹھنا دشوار ہو گیا اور رفتہ رفتہ یہاں تک
نوبت پہنچی کہ رفع ضروریات کے واسطے بھی خود نہ جا سکتے تھے اس حالت
میں مریدوں کا مجمع ہر لمحہ انکی خدمت میں حاضر رہتا تھا اور ان آخری دنوں میں
شاہ صاحب انکو بہت طبیعت ٹھیک ہوئی نصیحت فرماتے رہتے ایک روز
آدھی رات کے وقت طبیعت کو زیادہ گرانی ہوئی تمام مرید بھی سب حاضر تھے
کہ شاہ صاحب نے اپنی موت کے متعلق اس طرح گفتگو کی۔

مذہباً موت کی تمنا جائز نہیں اس لئے میں ہرگز موت کا متمنی نہیں مگر موت تو
حاصل ہونا مسلمان کی نشانی ہے اس لئے ہمیں چاہئے کہ موت کو یاد رکھا اور ہر
وقت اسکے لئے تیار رہا یہی تھی وہ تیاری جسنے دنیا اور دنیا کے فانی دلکش
میری نگاہ میں ہیچ کر دئیے اور میرا مقصد کسی طرح منزل مقصود تک پہنچا رہا
پھر بھی کون کہہ سکتا ہے کہ کیا ہوا اور کیا ہوگا۔ دنیا کا قیام قریب ختم ہو گیا
اور اب دوسرا سفر شروع ہوتا ہے یہ ہے وہ سفر جسکی ہر منزل کٹھن اور ہر قدم خوفناک
لوگ سمجھتے ہیں کہ موت انسانی زندگی کو ختم کر گئی مگر نہیں بات یہ نہیں ہے
موت کہتے ہیں انتقال کو یعنی تبدیل ہو جانا روح کا ایک جگہ سے تبدیل ہو کر
دوسری جگہ چلی گئی درحقیقت اسلام نے روح کا مسئلہ اسی طرح حل نہیں کیا

اور یہ ایک زبردست مصلحت تھی اور صرف حکم رب بتادیا مگر جہاں تک
اسلام سے ہماری سمجھہ کے لائق اسکی تصریح کی وہ یہ ہی ہے کہ روح ایک
جسم کو چھوڑکر دوسری ہئیت اختیار کرلیتی ہو اس کے معنی یہ نہیں ہیں
کہ زندگی ختم ہو گئی اگر ایسا ہو تو موت سے بہتر اور اچھی تو کوئی چیز ہو ہی
نہیں سکتی کہ سب عذابوں سے چھٹوادے۔ موت ہادم اللذات ہے اور
ان تعلقات کا خاتمہ کردیتی ہو جو یہاں ہمنے اپنی ذات کے ساتھ پیدا
کرلئے اور جو درحقیقت مستقل نہیں بلکہ ہماری زندگی تک یا اپنے وجود
تک کے تھے یہ تبدیلی یا انتقال موت سے ظہور پذیر ہوتا ہو۔ یونہچاتا ہی
ہمکو اس مقام پر جہاں اس زندگی کے اعمال وافعال کی جوابدہی اور بازپرس
ہے اور اسوقت تک صرف دو باتیں ہمارے سامنے ہوتی ہیں حقوق اللہ
اور حقوق العباد مگر سمجھنے کی بات یہ ہو کہ حقوق اللہ کے احکام صرف
حقوق العباد کی ادائگی کے واسطے مقرر کئے گئے ہیں جبتک کسی حاکم کا
ڈر نہ ہو رعیت باہمی سلوک اور اطمینان سے زندگی بسر نہیں کرسکتی
مذہبی قانون کا منشا صرف یہی ہے کہ مظلوم ظالم کے ظلم سے کمزور طاقتوروں
کی طاقت سے محفوظ رہیں دنیوی قانون تمکو چوری دغا مکر فریب سے
روکتا ہے اور قدرت کا قانون ہمسے کچھ اور توقع رکھتا ہو تم ہی جیسے
ہزارہا بندگان خدا جنکے ہاتھ پاؤں آنکھ ناک تمسے بھی بہتر ہیں بدتریں

زندگی بسر کر رہے ہیں اور تمہاری ہمدردی کے محتاج ہیں۔ رانڈیں جو پردہ
کی بیٹھنے والیاں ہیں معصوم بچوں کو کلیجہ سے لگا کر سنسان وقت میں
بھوکی پیاسی خاموش پڑ رہتی ہیں اور یہ وہ وقت ہوتا ہے جب تم اپنا
اور اپنے بچوں کا پیٹ بھر کر اچھی طرح خود کھا کر انکو کھلا پلا کر اپنے ہنستے
بولتے ہو کھیلتے کودتے ہو اور ایک لمحہ کو بھی اس بدنصیب کا خیال نہیں کیا
کرتے جسکا یتیم بچہ وہ وقت کے ہاتھ سے ماں کی گود میں ٹرامٹر مٹر اس کا
منھ تک رہا ہو اسکے سر پر وارث نہیں ہے جو اسکو کما کر کھلائے ہاں قدرت
نے اسکے حقوق اسوقت جب موت نے اسکو بیکس کر دیا تم پر مقرر کئے
اور یہی بہت بڑا حقوق العباد ہے۔ اپاہج بیکس حاجتمند جنکا دینے والا
سوا خدا کی پاک ذات کے کوئی نہیں کہاں سے اپنی ضرورتیں پوری
کریں خدا انکو خود آکر دینے سے رہا تمکو جو کچھ دیا ہے اس میں انکا حصہ
بھی شامل ہے نہیں دیتے خود کھاتے ہو غصب کرتے ہو ظلم کرتے ہو اور حقوق العباد
میں مبتلا ہوتے ہو۔ یہ ہیں وہ جرم جنکی بازپرس ہوتی ہے اور جنکی وجہ سے
میرا تمام اعمالنامہ سیاہ ہے میں کہنے کو کہہ رہا ہوں کہ موت کے واسطے
تیار تھا مگر غلط کہہ رہا ہوں ایک کام بھی ایسا نہ کیا جو گناہوں کا کفارہ ہو جاتا
امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے موت سے کچھ پہلے فرمایا تھا کہ ستر برس
زندہ رہا اگر دن رات میں ایک ایک گناہ بھی سرزد ہوا تو کتنے ہزار گناہ لیکر

حاضر ہونگا اس خیال کے آتے ہی ایک چیخ ماری اور گر پڑے موت اب ان گناہوں کا پردہ کھولے گی اور بتا دیگی کہ نہ وہ لذتیں رہنے والی تھیں نہ وہ وقت ہاں انکی یادگار ان کا ثمرہ اب خدا کے حضور میں حاضر ہو کر بھگتنا ہے تم لوگ میری عقیدت کا یقین کر رہے ہو اور سمجھتے ہو کہ میں بہت نیک آدمی تھا مگر میں ہی جانتا ہوں کہ گناہوں کی کیسی بھاری گٹھری میرے سر پر ہے وہ دربار بڑا ہے اور وہ شہنشاہ زبردست اور باوجود رحیم و کریم ہونیکے علی مرتضیٰ کے الفاظ یہ تھے۔

جا رہا ہوں جو صاحب عرش عظیم ہے شاید وہ بخشدے کہ غفور الرحیم ہے

بتاؤ اب میں کس گنتی میں ہوں۔

بچوں والی بیوہ کی موت

سلطان دلہن جسکا اصلی نام سعید بانو تھا ان بیویوں سے ہوئی بیٹیوں میں سے بیٹی ہو دمیں سے تھی جسکی نظیر اب تو کیا اسوقت بھی مشکل سے ملتی تھی نسوانی جا جو مسلمانوں کا ایمان اور عورت کا زیور ہے قدرت نے اسمیں کوٹ کوٹ کر بھر دی تھی بزرگوں کی اطاعت ساس سسروں کا ادب چھوٹوں کا لحاظ کردوں سے ہمدردی زبانی ڈھکوسلا اور اخباری شور سال ہی نہیں عملی طور پر ظاہر تھی شوہر برابر کا شریک نہیں سر کا سرتاج

اور ساس نندیں ماؤں کی جوتی نہیں سر کا سرپوش تھیں یہ وہ جوہر تھے
جو ماں کے دودھ کے ساتھ گھٹی میں پڑے اور سعیدہ بانو جہیز میں میکے سے
لیکر آئی گو زمانہ کی ہوا کے ساتھ چلنے والی دو چار نقدریاں یہاں بھی
موجود تھیں مگر پکا رنگ انکی صحبت سے چھوٹنے والا نہ تھا سعیدہ بانو وہ
عورت کہ دنیا ادہر کی اُدہر ہو جائے اور اسکی نماز قضا نہ ہو ٹھیک
مغرب کے وقت بارہ موسم سدا کیا جانے شروع شروع میں سلطان مرزا
کو بھی یہ شوق اور گھونگٹ کی نئی دلہن طبیعت پر زور ڈال کر رہ گئی کچھ
نکتہ چینی پر جس ہوا خاموش رہا بات کم کی مگر خیالات جو پرورش
پاتے پاتے راسخ ہو چکے تھے اب کہاں مٹتے اس پہ شوہر کی فرماں برداری
ایسی کی کہ چند ہی روز میں سلطان اسکے بارے میں دم بدم کرنے لگا۔
سعیدہ بانو گرچہ بڑے باپ کی بیٹی تھی (دادا صدر الصدور اور ڈپٹی ہو
کا سررشتہ دار) پہلوٹھی کی بچی اور اکلوتی اللہ آمین سے ملی ناز و نعم میں بڑی
مگر الفت و محبت ماتا اور جوش کسی چیز نے اسکو مستقل سے بیہوش نہ کیا
شوہر کی اطاعت ساس نندوں کی خدمت سے ساری سسرال گرویدہ
ہوگئی سلطان کی ترقی تحصیلداری پر ہوئی تو نہ جامہ سے باہر ہوئی نہ خاکساری
میں فرق آیا منکسر مزاج کی تھی اب بھی رہی اور ہمدردی جو شیوہ تھا
ہر وقت بھی اسکے ہاتھ سے نہ گئی۔

کہنے کو تو اولاد مفلس کے ہاں مصیبت اور مالدار کے ہاں نعمت ہی مگر
سب کہنے ہی کی باتیں ہیں غریب کی ماسا امیر سے کم نہیں ہوتی ہاں
امیر کے ہاں چاؤ چوچلے ارماں پورے ہوتے ہیں غریب دل مسوس کر
رہ جاتا ہی بانو اس نعمت سے کیوں محروم رہتی خدا اس سے راضی خلق خدا
اس سے خوش دس سال کے اندر تابڑ توڑ چھ بچے ہوئے۔ اوپر تلے
کے بہن بھائی برابر کے لڑکے برابر کی لڑکیاں دن بھر وہ غل مچتا کہ
کان پڑی آواز نہ سنائی دیتی اب اسکو چاہیے ماں کی سرست سمجھو یا باپ کا
خوف کہ اسکے سامنے تو ذرا امن ہو جاتا مگر اسنے باہر قدم رکھا اور پھر
وہی کچہریاں لگنی شروع ہوئیں بساہوا رما نہ تحصیلداری کا گھر خیالات
کی اچھی دل کی فراخ سو سو ترکاری اور سیروں مٹھائی پڑوسیوں تک کو
بانٹ دیتی کپڑا لتہ کھانا پانا فرش فروش حیثیت اول تو بابو ہی کا خاصہ
معقول تھا اور پھر سلطان کا شوق تو اس درجہ بڑھا ہوا کہ جب بازار گیا
کبھی خالی ہاتھ آیا ہی نہیں سو پچاس کا سامان لے ہی کر گھر میں گھستا میں قیمت
انگوٹھیاں اعلی درجہ کے ریشمیں کپڑے ایرانی قالین الواع و اقسام کی
میز کرسیاں غرض جتنا ساماں ایک اکیلی بانو کے پاس موجود تھا شاید
دو سارا اچھے اچھے رئیسوں کے ہاں ملا کر بھی اتنا نہ نکلے گا۔
الہ کلجگ ہیں کر ملک ہی تو یہ کہنا یقیناً صحیح ہو گا کہ بانو بگیاہ تھی

اور ظالم دنیا کا بے وجہ شکار ہوئی اور اگر نیک سے آزمائے جاتے
ہیں تو قدرت کے کاموں میں ہم رائے دینے والے کون سلطان دورہ
پر تھا جاڑوں کے دن تھے علی الصباح پرتال کو نکلا گھوڑی تیز بھی بندھی
ہوئی عرصہ کی ٹھنڈی ہوا لگتے ہی سرپٹ ہوگئی روکنا چاہا نہ رکی آسن
اکھڑ گئے سوار اچھا تھا مگر وقت کی بات اور موت اٹل گرا پاؤں رکاب
میں رہ گیا ظالم گھوڑی اب بھی نہ تھمی سر چکنا چور ہوگیا اور اسی حالت
میں تڑپ تڑپ کر مر گیا۔

الو کہنے کو تو نہایت ضابطہ اور مستقل مزاج عورت تھی اور کہنے کو کیا
تھی بھی باپ کی موت پر حالانکہ اسکی عاشق تھی نہایت صبر سے کام لیا۔
ما اور بانو جیسی بیٹی کی ماں جسکی محبت کنبہ بھر میں مشہور تھی دو دن میں چٹ
پٹ ہوگئی مگر بانو کی آنکھ سے آنسو نہ نکلا حقیقی بھائی جوان شیر اور ایک
چھوڑ دو دو بہنیں آنکھ کے سامنے سے اٹھ گئیں مگر استقلال میں فرق
نہ آیا لیکن سلطان کی موت نے چھکے چھڑوا دئیے روئی نہیں پیٹی نہیں
چیخی نہیں چلائی نہیں ہاں خاموش تھی گم سم ہر وقت کسی خیال میں مستغرق
اور ہر لحظہ کسی فکر میں سرسار بڑی خرابی یہ آکر پڑی کہ دیور نعلی گھونسا جسے
ہمیشہ کھایا اور سگا بھائی کے مرتے ہی دیدے بدل گیا اور ساری جائداد
دبا بیٹھا بانو پردہ نشین بیچے معصوم لڑنا تو درکنار کوئی بولنے کے قابل

ھی یہ تھا رتی رتی سارا مال قبضہ میں کر لیا اور سوا تھوڑے سے زیور
اور گھر کی معمولی چیزوں کے بالو اور اسکے بچوں کے پاس کچھ نہ رہا
سمجھا ساتھ خالی ہاتھ چھیجے اور بے ماداں بڑا مکان چھوڑ تین روپیہ
ماہوار کے مکان میں چلی آئی زیور اور اثاثہ کب تک چلتا ایک سال
ہی گھر میں خالصے لگ گیا اور نوبت فاقوں تک پہنچ گئی۔

اب البتہ بالو کے ہوش حواس بگڑ گئے آدمی کوڑی کی ہمت آٹا جائے
دونو وقت میں پا پسیر لوٹا اور کٹورہ دو سٹے اور والیں سب بک گئے
مگر پیٹ کی آگ کسی طرح نہ بجھی جب سارا گھر کا صفایا ہو گیا اور راست کرنے
کو تنکا تک نہ رہا تو سوچا مزدوری کروں سلائی سیؤں نوکری ڈھونڈوں
ماماگیری کروں لیکن کسی طرح ان معصوموں کے حلق میں ٹکڑا ڈالدوں۔
راتیں اس طرح کٹتیں کہ برسات کی اندھیری گھُپ راتوں میں مٹی کا دیا تک
نصیب نہ ہوا دن اس طرح بسر ہوتے کہ صبح سے شام تک بالو اور اسکے
کلیجہ کے ٹکڑے لوٹ لوٹ کر تیں بھوک کے پڑ رہتے اور قدرت کے زبردست انتظام
نیند کے فعل کو پورا کر دیا ایک دن پوری رات اور سارا دن سات دوپہر
فاقے سے بسر ہو گیا شام کے وقت ایک دو ہیں اکھٹے چار لال یکسا
ایک واہ کو ترستے اور ٹکر ٹکر ماں کے پہلو میں بیٹھے فاقہ زدہ بچے اور
بھوکے معصوموں کی صورت دیکھ کر کلیجہ کٹ گیا یہ پہلا دن اور شاید پہلا

موقعہ ہوگا کہ بانو کی آنکھ سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے بڑا بچہ جو مشکل سے
سات برس کا ہوگا ماں کے قریب آیا اور کہا اماں جان روتی کیوں ہو
بچے کے اتنا کہنے سے دل اور زیادہ بھر آیا مگر بچہ یہ کہتے ہی کلیجے سے لپٹ گیا
ماں کے آنسو پونچھ کر خود بھی رونے لگا کھینچ کر پیار کیا اور کہنے لگی نہیں میاں
رو نہیں رہی اللہ تمہاری عمر دراز کرے روؤں کیوں لگی۔

(بچہ) اماں جان بھوک زور کی لگ رہی ہے دیکھئے کل شام کی بیسی
روٹی کھائے ہوئے ہیں۔

(ماں) میاں صبر کرو دیکھو اللہ بھیجے گا ابھی سو جاؤ میں تم سب کو جگا کر
کھلا دوں گی۔

بانو نے کہنے کو یہ بات بچہ سے کہہ دی مگر طبیعت بھری آ رہی تھی
کہ کیا سے کیا ہو گیا جن کے در پر دو دو پہر تک نوکر اور آئیں موجود
تھیں آج وہ مٹھی مٹھی بیوں کو ترس رہے ہیں منہ پھیر کر رو رہی تھی اور
آنسو پونچھ کر چمکارتی تھی بانو ادھر تھی دروازہ پر بولا دال موٹ والا
او چھوٹا بچہ پیسہ کے مرمرے اور پیسہ کی دال موٹ لے آیا تنکر کی
جان ساٹ کیا تھی بھولی ٹھٹک رہی ساری دال اور مرمرے موری میں
گر پڑے دو دانے باقی رہ گئے ابھی ماں کے پاس پہنچا بھی نہ تھا کہ خوانچے
والے نے پیسوں کا تقاضہ کیا بانو کو اس وقت دو پیسے دو اشرفیوں سے

زیادہ تھے کچھ دیر خاموش رہی مگر جب اسنے زیادہ بگڑنا اور چلانا شروع کیا تو دروازہ پر آئی اور کہا۔

بھائی! تمسے سودا کیوں وہ پایا یہ ہے سب پھینکدیا اسوقت پیسے نہیں ہیں پھر سے جانا۔

چنے والا۔ پھر لیجانا، دو پیسہ کے لئے تو ضرور آؤنگا۔ میں نہیں جانتا پیسے دو میرے لاؤ لاؤ جلدی کرو دیر ہوتی ہے۔

بانو۔ بھائی میں سچ کہتی ہوں پیسے موجود نہیں ہیں پھر لیجانا۔

چنے والا۔ کیسی پھر عقل جاتی رہی ہو پھر لیجانا پھر لیجانا کیا مفت کا مال تھا۔ بچہ سے منگوا اور کھا لیا پیسے پھر لیجانا کوئی منٹس پر کمر باندھی ہو۔

گھبرا گئی پریشان ہو کر گھر میں آئی پیسہ تو درکنار کوئی چیز بھی نہ تھی کہ دیکر پیچھا چھڑاتی چنے والا زور شور سے چلا رہا تھا محلہ کے بچے جمع ہو گئے ایک نے اندر آکر کہا۔

ارے بی پیسے کیوں نہیں دیتیں اس بیچارے کو دیر ہو رہی ہو۔

بانو۔ اچھا میاں۔

دوسرا لڑکا۔ لاؤ تو لاؤ۔

بانو۔ اس سے کہہ دو پھر لیجائیو۔

لڑکا۔ وہ تو اب لیکر جائیگا پھر ور نہیں جاتا اور نہیں تو لڑکے کو مانجھ سمجھا دو

وہ اس سے لے لیگا۔

اتفاق کی بات تھی کہ اسوقت چمپا پرانی سائیسی مدتوں کے بعد نکل آئی سچے اسکو دیکھ کر اچھلنے لگے سلام کر کے بیٹھ گئی بانو کا رنگ دیکھکر دنگ رہ گئی اور چیخ دار ... کر کہا کہ۔

ارے بی بیبی وہی ہوا یا ڈاکہ ہی پڑ اُتر آئیں،،

بانو دہل گئی اور چمپا سے کہا ہوا میرے پاس دو پیسے ہیں،

چمپا نے کچھ سوچا اور پھر کہا آٹے کے رکھے ہیں لو لیلو۔

دو پیسوں کے واسطے بانو نے چمپا کے آگے ہاتھ پھیلایا اور پیسے جیسے والے کو بھیجدئے۔ بات معمولی تھی گئی گذری ہوئی مگر آج کا چرکا ایسا اسکے دل پر بیٹھا کہ ساری رات روتی رہی سوچتی تھی کہ وارث سر پر رہا نہیں میں ایک عورت ذات اور ان بچوں کا ساتھ کیونکر بانو گی کیا کروں گی یہاں تک نوبت لو پہنچ گئی اب رہ رہ کر بدتری ہی کیا ہوگا یہ دہا کا ایسا بیٹھا کہ آخر رات کو جب تارے کھلے ہوئے تھے اور بانو خدا کی قدرت میں محو اپنے مستقبل پر غور کر رہی تھی بخار چڑھا گلابی جاڑے تھے کپڑا بدن پر تھا نہیں سینہ میں درد شروع ہوا اندر آکر لیٹ گئی سمجھی کہ اب چلنے کا وقت ہے یہ خیال آتے ہی کلیجہ امنڈنے لگا بچوں کو ملا کر گلے سے لگایا ایک ایک سے چمٹی اور کہا کلیجہ کے ٹکڑو ماں کی حالت حرات

باپ کا سایہ تمہارے سروں سے اٹھ گیا ما اس قابل بھی نہ نکلی کہ تم
معصوموں کے پیٹ بھی بھر دیتی بیار و دیکھ رہی ہوں کہ پرسوں سے
بھوکے ہو مگر کیا کروں کوئی جگہہ نہیں کدہر جاؤں کس سے مانگوں
زندہ رہی تو کسی کے ہاں نوکری کر دونگی اور تمہارا پیٹ بھر دونگی دعا کرو
کہ اچھی ہو جاؤں بچوں بیٹھو میرے پاس بیٹھو یہاں سے نہ سرکو میری آنکھیں
تم کو دیکھ دیکھ کر ٹھنڈی ہو رہی ہیں او گو درد کی شدت بخار کی تیزی حد سے
زیادہ ہے مگر دل تمہاری صورتوں سے تسکین پا رہا ہے۔ فردوس دیکھ چھوٹا
رو رہا ہے اسکو گود میں لے لے لا میرے سینہ پر ڈالدے آ میرے چاند
میں قربان گئی اے اللہ شکر ہے ایک پیسہ نہیں کہ اسکو دودھ منگوا دیتی
تین دن کا بھوکا پیاسا شکر ہے ہمسکتے
بخار تیز ہو رہا تھا بچے چاروں طرف بیٹھے رو رہے تھے کسی کے سر پر ہاتھ
پھیرتی کبھی کسی کو کلیجہ سے لگاتی تھی روتی تھی بلکتی تھی سسکتی تھی اور چمٹتی تھی
روؤ مت کلیجہ کے ٹکڑو روؤ مت دعا کرو کہ اچھی ہو جاؤں برقع سر پر
لونگی باہر نکلونگی ٹہل کرونگی سدہیاگری کرونگی مگر اپنے بچوں کو بھوکا نہ رکھونگی
مگر ہائے مر جاؤنگی تو کیا کرو گے کسی کی غلامی کسی کی نوکری اے اللہ
رحم کر اسوقت تک زندہ رہوں جبتک یہ کمانے کے قابل ہو جائیں
فردوس حلق میں کانٹے پڑ گئے زبان سوکھ گئی کہاں جسکی بیٹی ہے

اری دیوانی نہ رو لا ذرا سا پانی پلا میں اچھی ہو جاؤنگی۔
مردوں بڑی بچی تھی سمجھتی تھی کہ کیا ہو رہا ہی ہچکی بندھ گئی دوڑ کر ماں کے
کلیجہ سے چمٹی دونوں ہاتھ اسکی گردن میں ڈالدئے اور کہنے لگی ہٹی ہراساں
نہ ہو اللہ رحم کریگا اری میرا پیٹ اچھل رہا ہی تجکو بخار نہ ہو جائے چمٹ
مت ہٹ جا۔

ننھا لڑکا خاموش بیٹھا حسرت سے ماں کے چہرہ کو تک رہا تھا گاہ اس پر
تو یہی کہنے لگی کیوں میرے لال چپکا کیوں ہی اُٹھتی ہوں بھیک مانگونگی
اور لاؤنگی آ آ میرے پاس آ میرے چاند آ لیٹ جا۔
بچہ کا دل پہلے ہی سے بھر رہا تھا ماں کے اتنا کہتے ہی بیتاب ہو گیا اور
چیخ مار کر گلے سے لگ گیا ماں کا ہاتھ تڑ سے بچے کی کمر پر تھا کہ ہچکی آئی
اور فاقہ زدہ بچوں کو ہوکا چھوڑ کر دنیا سے رخصت ہو گئی۔

٨ بادشاہوں کی موت

اب تک میں نے اور مولانا راشد الخیری نے جس قدر مضامین موت کی قسمت
اس کتاب میں لکھے وہ خیالی تھے یا واقعات کو خیالی پیرایہ میں دکھایا گیا
تھا یہ مضمون خالص تاریخی ہی جسکو رسالہ کم ٹو موت کے لئے جناب مولانا
عارف حسن صاحب عارف ہسوی نے تحریر فرمایا ہی مولانا عارف مشہور

اہل قلم ہیں جنکے رشحات علمی سے اکثر بڑے بڑے اخبارات فیض یاب ہوتے رہتے ہیں۔

حسن نظامی

موت کا فلسفہ بیان کرنا فضول سی بات - ہر عالم و جاہل اور ہر فلسفی و عاقل بغیر فلسفہ کے اسکی کیفیت سے واقف و آگاہ ہے۔ دنیا کی ایک چیز بھی ایسی نہیں بلکہ معلومات انسانی میں ایک وجود بھی ایسا نہیں جو شبہ و یقین کے منازل سے نہ گذرا ہو یہاں تک کہ وجود باری بھی شک اور یقین کی کشمکش میں پڑ گیا - لیکن دنیا خواہ ہر چیز کو حتی کہ اپنے نفس و وجود کو بھی شک و شبہ سے دیکھے لیکن موت کی نسبت جرات نہیں کرسکتا - ہر شخص جانتا ہی کہ موت ہادم اللذات ہی اسکا آنا برحق اور اسکے نتائج مخزنہ کا مرتب ہونا یقینی ہی نہ عجز و مسکینی اس کو روک سکتی ہی نہ سلطنت کا جاہ و جلال اسکو منع کرسکتا ہی نہ تقوی و طہارت اسکو مار رکھہ سکتا ہی - فقیر کا ٹوٹا ہوا جھونپڑا اور بادشاہ کا عالی شان قصر حکومت اسکے نزدیک دونوں یکساں ہیں جس طرح وہ کھلے ہوے میدان میں بآسانی گذر کرسکتی ہی بالکل اسی طرح تہمتنا ہوں کے برج مشیدہ میں بھی داخل ہو جاتی ہی - اسے بوڑھے باپ کی بیکسی اور دکھیاری ماں کی بیکلی پر کبھی رحم نہیں کیا وہ آرزوؤں کے ہجوم اور تمناؤں کے

اژدہام کی مایوسانہ حالت اسے کبھی مرعوب نہیں ہوئی۔ اس کا وجود
رنج و مصیبت سے ناآشنا اور اسکی ہستی راحت و مسرت کے احساس سے
بیگانہ ہے وہ جس طرح عجب و غرور تمرد و سرکشی اور ظلم و سفا کی کو برباد
کر دیتی ہو اسی طرح عفو و رافت تقوی طہارت اور انسانی رحم دلی و
ہمدردی کا بھی خاتمہ کر دیتی ہے۔ اسکے نزدیک اضطراب و بیقراری
بےچینی و بیتابی مہمل الفاظ ہیں اور آہ و زاری فغاں سنجی و ماتم گساری
کوئی معنی نہیں رکھتے۔ اسکی سنگدلی رحم سے بے نیاز اور اسکی ممات
پسندی لطف و کرم سے مستغنی ہے۔

لیکن بااین ہمہ میں کہتا ہوں کہ انسان کا بہترین دوست موت ہے
اسکی دشمنی سراپا اکرام اور اسکی عداوت یکسر رافت و انعام ہے اگرچہ
وہ عافیت کی دشمن ہو مگر عاقبت کی رہبر اور آخرت کی رہنما ہے اس کا
ورود ذات قدوس کی معرفت کا زینہ اور اس کا وجود بصائر و تفکر کا گنجینہ ہے
اگر چشم بصیرت سے کام لیا جائے تو موت ہدایت اخروی کا سب سے
زیادہ موثر واعظ ہو وہ اپنے آثار حزن و ملال کے اندر انسانی عبرات کے
لیئے عبرت اندوزی و سبق آموزی کی لاتعد و لاتحصی کتابیں مخفی رکھتا ہے
خوش بیان واعظوں کی سحر کلامیاں بید و نصیحت کے دفاتر اور خطبات
شریعت کے لعنت تنبیہ و سرزنش الہی شاید ہی وہ اثر رکھتے ہوں جو

کر سکتی جسقدر موت سکے یکبہ ہلاکت وفنا کی ضرب ایک گہرا زخم پہنچا
دیتی ہے۔ حکومت کا گہرا گراں اور اخلاق کا اثر اور دفتر موعظت
انسانی غرور و غفلت کو اس قدر جلد شکست نہیں دے سکتا جس قدر
جلد موت کی بے رحمی کے آگے اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔
غرضکہ موت جسکو تم ظالم و خونخوار سمجھتے اور اپنا بے رحم دشمن خیال کرتے
ہو حقیقت یہ ہے کہ وہ تمہارا ناصح مشفق ہے۔ تمہارے کسب اعتبار کیلئے
پند و موعظت کے دفاتر کھول دیتی ہے اسکو گمراہیوں سے بچاتی اور
ضلالت سے روکتی ہے تم دیکھتے ہو اگر انسان خالق کو بھول جاتا ہے
وہ اسکی یاد دلاتی اور بہتر بارہ کرتی رہتی ہے۔

یوں تو ہر ذی حیات کی موت ایک قسم عبرت ہے۔ یہی سی
چیونٹی جسکو تم غفلت و غرور کے پاؤں سے مسل ڈالتے اور ہلاک کر
ڈالتے ہو اسکی موت بھی عبرت سے خالی نہیں تمہاری طرح اس کا حقیر
جسم بھی درد و تکلیف کو محسوس کرتا ہے دکھ سے وہ بھی بھاگتی ہے اور رنج
رہتی ہے کہ وہ بھی [illegible] ہے کہ تم ایک چیونٹی کی موت [illegible]
دیکھتے ہیں ہوئے [illegible] چشم [illegible] موت کبھی کچھ کم عبرت خیز نہیں
[illegible] بار ستاہوں [illegible] کی ایک [illegible] ہے جو فانی
انسان کی [illegible] اس پر منکشف کر دی ہے

کیسے بڑے بڑے بادشاہ جنکے نام سے دنیا لرز جاتی تھی آج پیوند
خاک ہیں۔ بنی امیہ کے ظلم و سفاکی اور جبر و تعدی کے صرف افسانے
باقی ہیں مگر انکی بربریت صورتیں موت نے ہمیشہ کیلئے خاک و خون میں
ملا دیں۔ بنو عباس کا جاہ و جلال کیا ہوا جنکے سطوت و جبروت سے
قیصر و کسریٰ کے بدن لرزہ براندام ہو جاتے تھے اور جو فرانس کے
شہنشاہ کو کلب الروم (رومی کتے) کے خطاب سے یاد کرتے تھے۔
جن کا آستان جلال غرور و نخوت کا سجدہ گاہ تھا جنکے چشم و ابرو کے
اشارہ پر خون کے دریا بہہ جاتے تھے جنکا غیظ و غضب شیر دل کے
پتے پانی کر دیتا تھا جنکا لطف و کرم گداگروں کو امیر الامراء اور جنکی تحسین
و آفرین غلاموں کو تخت و تاج کا مالک بنا دیتا تھا۔ جو ایک بیہودہ غزل
پر ہزاروں اشرفیوں کے تحت [illegible] لٹا دیتے تھے جو ایک
علمی مسئلہ کے حل اور ایک عمدہ شعر کے صلہ میں [illegible] مصر کے خراج کو
بخش دیتے تھے۔ جنکے عالیشان قصر زر و جواہر اور الماس و یاقوت
کی چمک سے قصور جنت کے مشابہ اور جنکی تفریح گاہیں اپنی
سیر کے باغات گلزار ارم کے مماثل تھے آج وہ کیا ہوئے اور ان کا حشر
کیا ہوا تمکو معلوم ہے اور تم جانتے ہو کہ [illegible] کو موت کے زبردست
ہاتھ نے سپرد خاک کر دیا انکی سطوت انکا جلال صرف کتابوں میں

باقی ہیں مگر وہ نہیں رہے اور نہ کبھی اس دنیا میں لوٹ کر آئینگے۔
سلجوقیوں کا نام و نشان نہ رہا خلجیوں کی دولت و اقبال برباد ہوگئی
غزنوی حکومت کا خاتمہ ہوگیا تیموری خاندان کی تباہی و بربادی پر
اُنکے قائم کردہ آثار زبان خموشی سے نوحہ خوانی میں مصروف ہیں یہ
سب موت کے طلسم انقلاب کے نتائج ہیں۔

دہلی سے تھوڑی دور پر تغلق آباد یا فیروز آباد کے کھنڈروں کو
دیکھو گے تو اسکے بانی کی تصویر سامنے آجاتی ہے جو ایک ہیبت ناک مقبرہ
کے اندر مصروف خواب ہے یہ مقبرہ فیروز شاہ تغلق کا ہے جسکی وجاہت ہیبت
و جبروت آج بھی زائرین کے قلوب کو عظمت و وقار سے مرعوب کردیتی
ہے یہ نیک دل عالی حوصلہ کریم النفس اور دانشمند بادشاہ آج سے
پانسو برس پہلے ہندوستان کا سب سے بڑا بادشاہ تسلیم کیا جاتا تھا فیروز آباد
کا عظیم الشان شہر اسنے آباد کیا عالیشان عمارتیں بنوائیں دہلی کے قرب
و جوار میں بارہ سو باغات لگوائے تمدنی و اقتصادی ترقی میں نہایت
زیرکی و دانشمندی سے سرگرم رہا۔ مالیات کا نیا اور سہل العمل قانون
بنایا اور نافذ کیا رعایا کی فلاح و بہبود میں کبھی غفلت نہ برتی فیروز شاہ
کی نیک نیتی صرف اسی ایک واقعہ سے ظاہر ہوتی ہے کہ چالیس سال
کے عہد حکومت میں کبھی اسکی رعایا کو قحط سالی کے آلام و مصائب سے

سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اسکی فیاضی و دریا دلی نیز مخلوق نوازی اور رعیت پروری کا اندازہ اس سے کرلو کہ جس وقت وہ تخت حکومت پر جلوہ افروز ہوا جسقدر تقاوی لگان اور تقاوی کا سرکاری روپیہ رعایا کے ذمہ تھا سب معاف کردیا اور نہ صرف معاف کردیا بلکہ وہ تمام کاغذات جنمیں یہ حساب وکتاب تھا جلوادیا۔

وہ تمام عمر حوصلہ مند بادشاہوں کی طرح مہمات ملکی کے سر کرنے میں مشغول رہا گجرات اور ٹھٹھہ کی مہموں کو اسنے فتحمندانہ خاتمہ تک پہنچایا سکندر خاں کو شکست دی اور دوسرے باغیوں اور مفسدوں کا بھی قرار واقعی استیصال کردیا لیکن باوجود جنگی مصروفیت کے ملک کے اندرونی انتظامات سے کبھی غافل نہ ہوا۔ وابستگان دامن دولت کا اس قدر خیال ملحوظ خاطر رہتا تھا کہ اسکے لئے یہ عام قاعدہ مقرر کردیا کہ جب کبھی کوئی ملازم سرکار فوت ہو تو اسکی جگہ پر بہرحالت میں اسکا بیٹا مقرر کیا جائے بیٹا نہ ہو تو اسکا داماد داماد نہ ہو تو غلام اور غلام بھی نہ ہو تو کوئی رشتہ دار اور اس کا رشتہ دار بھی نہ ہو تو اسکی بیوی کا کوئی قریب یا بعید کا رشتہ دار اس جگہ پر مقرر کیا جائے اس حکم سے متاثر ہوکر شیخ الاسلام شیخ بہاوالدین زکریا ملتانی نے لکھا ہے کہ آدمی کو مرنے کے دو طرح کے غم ہوتے ہیں ایک تو وارثوں کا سوا اسکا حال کسیکو نہیں معلوم کہ کیا ہوگا دوسرے دنیا کا کہ میرے بعد

میری اولاد اور اعزا کیا کرینگے کیونکر زندگی بسر کرینگے مگر اس بادشاہ
نیک نہاد نے دنیا کے غم کو دور کردیا کیونکہ ہر شخص مرنے کے وقت مطمئن
ہوتا ہے کہ میرے بعد میری اولاد میری جگہ پر مقرر کردی جائے گی
اور جس طرح میری گذر اوقات ہوتی تھی اسی طرح میری اولاد کی بھی
ہوگی۔

فیروز شاہ بڑی شان و مرتبہ کا بادشاہ ہوا ہے وہ نہایت مستقل مزاج
اولوالعزم صاحب اقبال اور جاہ جلال تھا فیروز آباد جیسے عظیم الشان
شہر کی تعمیر اسکی حوصلہ مندی کی دلیل ہے نوے برس کی عمر پائی اور چالیس
برس تک بڑی شان و شوکت کیساتھ سلطنت کی۔ آخر عمر میں جو ایسی
کچھ تعطل سا وار ہوا تو ایک بد باطن وزیر نے دربار [illegible] اسکے بیٹے
کی گرفتاری کا حکم صادر کردیا مگر وہ اپنے مکان میں مقفل ہو کر بیٹھ گیا اور
موقع پاکر مسلح ایک ہزار آدمی لیکر شاہی زنان خانہ میں داخل ہوگیا
اور وہاں سے بادشاہ کے حضور پہنچکر قدموں میں سر رکھ دیا اور عرض
کیا کہ اگر میرا ارادہ کچھ اور ہوتا تو اس وقت سے اچھا کونسا موقع تھا یہ محض
وزیر کی شرارت ہے کہ حضور کو میری طرف سے بدظن کردیا وہ چاہتا ہے کہ
میری زندگی کا خاتمہ کرکے خود تخت حکومت پر بیٹھ جائے۔

فیروز شاہ نے اس کا سر اٹھاکر سینہ سے لگا لیا اور وزیر کے قتل کا حکم دے دیا

کر دیا۔ اسکے بعد خود فیروز شاہ تخت سے علیحدہ ہو کر یاد الٰہی میں
مصروف ہو گیا اور بیٹے کو مہام سلطنت سپرد کر دیا۔ تھوڑے دنوں
زندہ رہا اسکے بعد ۲۳۔ رمضان سنہ ۷۹۰ھ کو وفات پائی۔ وفات فیروز
مادۂ تاریخ ہے۔

وہ فیروز شاہ ہی جسکی عظمت اسکے بنا کردہ شہر کے کھنڈر دل سے
اب تک ٹپک رہی ہے لیکن اب اسکی اقبال مندی کا کوئی نام باقی
نہیں رہا صرف چند ویران و وحشت ناک کھنڈر ہیں جو اسکی [illegible]
کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ یہ کھنڈر عبرت کی تصویر اور تصیر سا کا مرقع ہیں
جن مکانوں میں شمع کافوری جلتی تھی آج ان میں مٹی کا چراغ تک
نہیں جلتا کسی وقت یہی فیروز شاہ تھا جسکے جلوس میں لاکھوں سواری
زرق برق رشاکر [illegible] ہوتے اسکی محافظت کرتے [illegible] مگر اب دہر
نے وہ سارے سامان ہلاکت تمام برباد کر دئے۔ یہ ہزاروں من
خاک کے نیچے دبا ہوا سو رہا ہے نہ کوئی محافظ ہے نہ دربان، شمع ہے
نہ فانوس نہ وہ سامان ہے نہ اسباب اس کا مقبرہ وحشی جانوروں کا
مسکن اور منحوس طائروں کا نشیمن ہے

چشم واکتا و حال شاہاں رانگر — تا چہ ماں از گرہ ترک و در گوش [illegible]
پردہ داری میکند بر قصر قیصر عنکبوت — بوم نوبت میزند بر گنبد افراسیاب

کل من علیہا فان ۰ ویبقی وجہ ربک ذوالجلال والاکرام

موت کا وقت آتا تو سارے ہی دوست احباب رشتہ دار دوسری راہ لیتے ہیں

سپاہ و علم آلی مرتبہ جاہ و جلال سب یہاں رہ جاتے ہیں دولت و ثروت تنہا کی

پھر دیکھو کہ بادشاہ کی موت کس درجہ عبرت پذیر ہوتی ہے موت کی

تکلیف ترک تعلق کی وجہ سے ہوتی ہے جسکے تعلقات زیادہ وسیع ہوتے ہیں

اور جسقدر دنیا کی چیزوں میں وابستہ ہوتا ہے اسی قدر رنج و محن زیادہ

رہتا ہے اگر آرزوئیں محدود اور تمنائیں مختصر ہوں تو اسی نسبت سے

انکی جدائی کی تکلیف ہوتی ہے لیکن بادشاہ کی وابستگی اور ان کے وسیع

تعلقات کا کیا ٹھکانا ہے

ایک گداگر کی موت بادشاہ کی اہم نہیں اسلئے کہ وہ یہاں کوئی مال یا

شان و حشم کا اجتماع چھوڑ کر نہیں جاتا اسکے لئے اتنی تکلیف ہو لیکن بادشاہ

جسکو ہر قسم کی نعمتیں حاصل ہیں عیش و آرام اسکے در کے غلام اور راحت

سے رہتا اسکے گھر کی لونڈی رہتی ہیں دنیا کو ہم کی حسرت سے رکھتے ہیں

ادہر کی دنیا ادہر کرتے ہیں - کھانیکے لئے بہترین غذائیں سونے

کے لئے نفیس ترین گھر رہنے کیلئے عالیشان محل سیر کیلئے بہت بڑا

تفریح گاہیں خرچ کرنے کیلئے بیشمار دولت حکم پر چلنے کیلئے لاکھوں

آدمی - آہ کیسا درد انگیز اور الم انگیز وقت ہوتا ہوگا جبکہ ان سے جدا

ہوتے ہونگے ایک ایک چیز پر آکی نگاہ حسرت بار پڑتی ہوگی اور انتہائی مایوسی سے سائنڈ دہ سب کو چھوڑنے پر مجبور ہوتے ہونگے۔

اس سے زیادہ عبرتناک شاہجہاں کی موت ہو جو تیموری خاندان کا چشم و چراغ تھا جسنے عرصہ تک باصد شان و شکوہ حکومت کی اتنی بڑی وسیع اقلیم ہند کا یکہ و تنہا فرماں روا بیشمار خزانے کا مالک لاکھوں آدمیوں کی فوج اسکی تابعدار اور اسکے حکم پر جان دینے کے لئے طیار جسنے دلی جیسے عظیم الشان شہر کو آباد کیا تاج محل لال قلعہ موتی مسجد اور جامع مسجد دہلی جیسی عدیم النظیر عمارتیں بنوائیں مگر مرا تو اس شان سے کہ نہ وہ تخت تھا نہ تاج نہ فوج تھی نہ سپاہ نہ حکم تھا نہ فرمان نہ وہ شان و شوکت تھی نہ وہ شاہانہ اقتدار سب بیدخل سب سے جدا قلعہ کے اندر قید کی بیکسی کے عالم ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

نادر شاہ جیسا جبار و ظالم بادشاہ جسنے ایران سے لیکر ہندوستان تک خون کا دریا بہا دیا لاکھوں انسانوں کو جانوروں کی طرح بیدردی و بیرحمی کے ساتھ ذبح کرا دیا شہروں کو آگ لگا کر خاک سیاہ کر دیا انسانی آبادی کا مستقر جنگلی جانوروں کے رہنے کا بھٹ بنگئی ظلم و سفاکی سر و تعدی

خونریزی و خونخواری کا پیکر مجسم ہے۔ بے قصور انسانوں کو آپ اپنے
قتل پر مجبور کر دیا جسنے خوجہ چین کسانوں کو یہ کہکر تلوار کے گھاٹ اتار دیا
کہ این بیچارگان را ازین محنت خلاص کنید

وہ بھی موت کے پنجہ سے نہ بچ سکا دن بھر قتل و غارت کا تماشہ
دیکھتا رہا رات کر اپنے خیمہ کے محافظ سپاہیوں کو یہ حکم دیکر سویا کہ صبح
تم آپ اپنی گردن مار دینا۔ اگر اس سے پہلے حکم دے چکا تھا اور
اقبال مندی نے اسکو پورا کر دیا تھا لیکن اسکو کیا معلوم تھا کہ جو حکم اس نے
دوسروں کے قتل کا دیا ہے وہ اسی کا خاتمہ کر دیگا چنانچہ ان محافظین
نے طے کر لیا کہ اس مصیبت سے وہ کوتاہ [illegible] بادشاہ جو نادر شاہ
کا قتل و خونریزی کا تماشہ دیکھتا رہا [illegible]
[illegible] چاروں طرف ہتھیار رکھ کر سوتا [illegible] خواہ تلوار لئے
ہوا ہو یا مردوں کا اسکی آمد کو کوئی نہیں روک سکتا چنانچہ ان چار
محافظین میں سے دو تو اس ارادہ ہی سے مرعوب ہوکر پھر گئے اور
ایک درمیان تک جاکر واپس آیا لیکن چوتھا اندر داخل ہوا اور قبل اسکے
کہ نادر سنبھلے اور تلوار پکڑے اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔

نادری نادر تھا جسکے چشم و ابرو کا حسین سی [illegible] سے دلی کی گلیاں
[illegible] کے خون سے گلنار ہو گئی تھیں لیکن آج اسکا منظر و [illegible]

ڈنٹھال کی طرح تمام فوج میں پاؤں سے ٹھکرایا جا رہا تھا وہ فوج و لشکر
جو ماوری حکم پر جان قربان کر رہا تھا آج اسکے سر کا تماشہ بنائے ہوئے
تھا۔ بیک گردش چرخ نیلوفری   نہ نادر بجا ماند نے نادری

دنیائے اسلام میں مظلوم کربلا حضرت سیدنا امام حسینؑ کے بعد عبداللہ
بن زبیر کی موت بھی بصائر و عبرت کا گنجینہ ہے۔

عبداللہ ابن زبیر قرن اولی کے ان چند مخصوص اصحاب میں سے
ہیں جنکو خداوند قدوس نے عقل و دانش فہم و ذکا تدبر و تفکر میں ممتاز
درجہ عطا فرمایا تھا۔ خصوصاً سیاسی تدبر میں آپ کا درجہ بہت بلند تھا
معاویہ انکی طرف سے ہمیشہ خائف رہے چنانچہ مرتے وقت یزید کو
چھ آدمیوں کی نسبت وصیت کی انمیں ایک عبداللہ ابن زبیر بھی تھے
انکی نسبت انہوں نے کہا تھا کہ اس پر اگر قابو پایا تو ہرگز مت چھوڑنا
ورنہ یہی شخص تمہاری سلطنت کو متزلزل کر دیگا۔

عبداللہ ابن زبیر نے معاویہ کے بعد ہی دعوت شروع کی ان کے
مقاصد کو کامیاب بنانے میں انکے بھائی مصعب ابن زبیر بھی برابر
کے شریک کار تھے چنانچہ بنوامیہ کی سطوت و جبروت کے باوجود
ابن زبیر کو اس قدر کامیابی ہوگئی کہ تمام حجاز اور عراق کا زیادہ حصہ

کچھہ ایران کی زمین پران کا قبضہ و دخل ہو گیا اور یہاں کے لوگوں نے عبداللہ ابن زبیر کی بیعت کر لی۔ گویا قریب قریب نصف سلطنت پر قابض ہو گئے۔

لیکن ظالم کی رسّی دراز خدا کو منظور تھا کہ بنی امیہ کے مظالم و ستمگاریاں حد سے گذر جائیں اور مظلوم کی بیکسی آخر نقطۂ مایوسی پر پہنچ جائے چنانچہ عبداللہ ابن زبیر کی فتوحات کا سلسلہ ختم ہو گیا اور رجعت قہقری شروع ہوئی مصعب مارے گئے اور تمام مقبوضہ ملک ہاتھ سے نکل گیا صرف مکہ معظمہ پر ابن زبیر کا قبضہ تھا جسکو انہوں نے اپنی شہادت کے بعد ہاتھ سے جانے دیا

مصعب ابن زبیر کے قتل اور مقبوضات کے ہاتھ سے نکل جانے کے بعد عبداللہ ابن زبیر مکہ میں قلعہ بند ہو گئے اور عبدالملک نے تین ہزار لشکر کے ساتھ حجاج بن یوسف ثقفی کو روانہ کیا اور ابن زبیر کو لکھنے کے واسطے ایک امان نامہ بشرط اطاعت لکھکر حجاج کو دیدیا۔

حجاج جمادی الاولیٰ ۷۲ھ کو کوفہ سے روانہ ہو کر طائف میں خیمہ زن ہوا اور وہیں سے وقتاً فوقتاً لڑتا رہا چند روز کے بعد حجاج نے عبدالملک کو لکھا کہ عبداللہ ابن زبیر کی قوت بالکل گھٹ گئی ہے اگر آپ حکم دیں اور میری امداد پر مدد بھیجیں تو انکا محاصرہ کر لیا جائے امیر عبدالملک نے طارق کو حجاج کی امداد پر مامور کیا چنانچہ طارق مدینہ منورہ آیا وہاں

ابن زبیر کے گورنر کو معزول کر کے اپنا گورنر مقرر کیا اور پانچ ہزار سواروں کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔

حجاج اسکے آنے سے قبل احرام باندھ کر حدود مکہ میں داخل ہو گیا۔ اور بیر میمونہ پر قیام کیا مگر حج کیا نہ طواف اور نہ سعی کی اور نہ قربانی اور عبداللہ ابن زبیر کو عرفات میں داخل ہونے سے روک دیا مجبوراً انہوں نے مکہ ہی میں قربانی کی۔ حالانکہ ابن زبیر نے حجاج کو طواف و سعی بین الصفا والمروہ سے منع نہیں کیا تھا۔

اسکے بعد حجاج نے کوہ ابوقبیس پر منجنیقیں نصب کرائیں تاکہ مکہ پر سنگباری کرے اس سال عبداللہ ابن عمرؓ حج کے لئے تشریف لائے تھے انہوں نے حجاج سے کہلا بھیجا کہ دور دور سے اللہ کے بندے اسکے گھر کی زیارت اور اسکا فریضہ ادا کرنے آئے ہیں انکو اطمینان سے حج و عمرہ کر لینے دو اور اسکے بندوں کو اسکی عبادت سے مت روکو چنانچہ حجاج نے تا انقضاء حج سنگباری موقوف کر دی اور منادی کرا دی کہ لوگ اپنے اپنے گھروں اور گھروں کو واپس چلے جائیں ہم ابن زبیر پر سنگباری کرینگے۔

اسکے بعد حجاج نے ابن زبیر پر سنگباری شروع کرا دی پہلا پتھر جسوقت خانہ کعبہ پر گرا تو آسمان سے ایک سخت خوفناک اور مہیب کڑک سنائی دی جس سے بیسیوں اہل شام مر گئے اس واقعہ سے حجاج

لشکر میں خوف و ہراس طاری ہوا تو حجاج نے کہا کہ میں ابن تہامہ ہوں ڈرو نہیں یہ کڑک اور بجلی میری فتح کی خوشخبری ہے۔ اتفاق سے دوسرے روز بجلی گری اور ابن زبیر کے دو ہمراہی مر گئے۔

اسکے بعد حجاج نے جوش میں آکر خود مکہ معظمہ پر پتھر برسائے عبداللہ ابن زبیر کے آگے بڑے بڑے پتھر آکر گرتے تھے مگر وہ پیکر استقامت و مجسمہ استقلال اسی حالت میں کھڑے نماز پڑھا کرتے تھے۔

عرصہ تک اسی طرح جنگ ہوتی رہی بالآخر محاصرہ کی طوالت سے باہر کی ہوئی رسد کا آنا بند ہوگیا تھا اسلئے محصور کی سختی ناقابل برداشت ہوگئی۔

عبداللہ ابن زبیر نے اس حال پر لوگوں کو قائم رکھنے کی غرض اور جوش پیدا کرنیکے واسطے اپنا گھوڑا ذبح کر ڈالا اور اسکا گوشت تقسیم کر دیا اگرچہ عبداللہ ابن زبیر کے پاس غلہ اور کھجور کا ذخیرہ بہت جمع تھا مگر وہ عاقبت اندیشی کی وجہ سے نہایت کفایت شعاری سے حسب ضرورت تقسیم کرتے تھے۔

جب محاصرہ کو زیادہ طول ہوا تو حجاج نے ایک امان نامہ لکھکر بھجوا دیا اس سے عبداللہ ابن زبیر کے ہمراہیوں میں سے دس ہزار آدمی نکل کر جاملے اور انکے ہمراہ دوسرے فرزند حضرت عبداللہ ابن زبیر کے

دو بیٹے اسکے جدا ہو کر دشمن سے مل گئے جنکے نام حمزہ اور حبیب تھے
البتہ تیسرا لڑکا باپ کی رفاقت پر آخر دم تک قائم رہا اور عین معرکہ
قتال میں کام آگیا۔

اسکے بعد حجاج نے فوج کو ایک تقریر کے ذریعہ جوش دلایا اور کہا
کہ اے بہادرو جوانو اور آگے بڑھو اسکے بعد تو تمہیں کھیل جاؤ کیونکہ ابن زبیر
اب چند ساعت کے اور مہمان ہیں ابن زبیر کو اسکی اطلاع ہوئی تو
وہ اپنی ماں کے پاس گئے اور کہا اے ماں اپنے لوگوں نے دھوکہ
دیا اور ذلیل کیا یہانتک کہ میرے لڑکوں نے بھی مجھکو رسوا کیا۔
اگر میں چاہوں تو مخالفین مجھکو دنیا دے سکتے ہیں اب آپ کی کیا رائے
ہے؟ اسما ام زبیر نے جواب دیا کہ بیٹا اپنے معاملہ کو تم مجھسے بہتر سمجھتے ہو
لیکن اگر تم حق پر ہو اور اسی کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے رہے ہو جو
کر رہے ہو کرتے رہو۔ اور اپنی گردن ایسی بنی امیہ کے ہاتھ میں نہ دو کہ بنی
امیہ کے چھوکرے اس سے کھیلیں۔ اگر تم نے دنیا حاصل کرنا مقصد
کیا تھا تو تم نا اہل بندے ہو اپنے کو بھی ہلاک کیا اور دوسروں کو بھی۔
اگر تم یہ کہتے ہو کہ میں حق پر ہوں مگر ہمراہیوں سے دھوکا پایا تو شرفا
سکوں کا نہیں ابن زبیر نے کہا کہ مجھے خوف ہے کہ لوگ میرے قتل کے
بعد مجھکو مثلہ کریں گے اور صلیب پر چڑھا دینگے۔

اسپر اسماء نے فرمایا اے میرے بیٹے! بکری جسوقت ذبح کردی گئی
تو اسکو کھال کھینچے کی پرواہ نہ ہوگی۔ تم جو کچھ کر رہے ہو بصیرت کے
ساتھ کئے جاؤ اسکے بعد ابن زبیر نے ماں کے سر کا بوسہ دیکر کہا
میری بھی یہی رائے ہے۔ اسوقت تک نہ مجھے دنیا کی خواہش ہوئی
نہ حکومت کی آرزو میں اس کام کے لئے صرف اسوجہ سے مجبور ہو گیا کہ
خدائے تعالے کے اوامر کی بجا آوری نہیں کیجاتی اور اسکے مناہی سے
لوگ اجتناب واحتراز نہیں کرتے میں نے مناسب خیال کیا کہ آپ سے
بھی مشورہ لیلوں۔ پس واقعہ یہ ہے کہ آپنے میری بصیرت زیادہ کردی۔
اور اے میری ماں! میں آج ضرور مارا جاؤنگا تم زیادہ مغموم و رنجیدہ
نہ ہونا اور تم مجھے اللہ کے سپرد کردو۔ تمہارے لڑکے نے کسی فعل منکر
کے ارتکاب کا قصد تک نہیں کیا اور نہ کسی امر مذموم و بدکاری کی طرف
توجہ کی! نہ اسنے بدعہدی کی ہے نہ کسی پر ظلم کیا ہے نہ کسی ظالم کا معین و
مددگار ہوا ہے اور نہ اسنے حتی الامکان اللہ کی خلاف مرضی کوئی کام کیا ہے
اے اللہ میں اس امر کو اپنے نفس کی برات کی غرض سے نہیں
ظاہر کرتا بلکہ اسلئے کہ اپنی ماں کی تسکین خاطر کردوں۔
اسماء بولیں مجھے امید ہے کہ اللہ تم کو اسکا اجر جمیل عطا فرمائیگا۔ تم
اللہ کا نام لیکر حملہ کرو اگر تم فتحیاب ہوئے تو میں مسرور ہونگی اگرچہ

لڑائی پر جانیکی اجازت دیدی مگر ماں تھیں پالا پرورش کیا تھا ہوکس جی
سے ہوتا کہ موت کے منہ میں اپنے بچہ کو دیکر آپ گھر بیٹھ رہتیں کچھ
سوچیں اور سوچ کر فرمایا اچھا میں بھی تمہارا انجام کار دیکھنے چلتی ہوں مگر
ابن زبیر نے کہا آپ تکلیف نہ فرمایئے آپکو اللہ جزائے خیر دے البتہ دعائے
خیر سے مجکو فراموش نہ کیجئے گا - ابن زبیر کے ان الفاظ سے محبت مادری
میں جوش آگیا تمام جذبات برانگیختہ ہو گئے دیکھ رہی تھیں کہ بیٹا مرنیکے
لیئے جارہا ہے اسکے یہ الفاظ تیر کی طرح جگر میں پیوست ہو گئے بے تحاشا
ہوگئیں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور لپٹ گئیں یہ آخری پیار تھا
اور رخصتی کا آخری معانقہ اسکے بعد ابن زبیر اپنی ماں سے رخصت ہو
معانقہ کے وقت اسمار کا ہاتھ زرہ پر پڑ گیا - دریافت کیا یہ کیا ہے اور کس
لیئے ہے - عبداللہ ابن زبیر نے کہا محض اطمینان و مضبوطی کی غرض سے
پہن لیا ہے - حضرت اسمار نے وہ زرہ اتاری اور معمولی کپڑے زیب تن
کرنیکے لیئے فرمایا اسکے بعد ابن زبیر نے آستینیں کہنیوں تک چڑھائیں
قمیص کے دامن کمر سے باندھ لیئے اور بسم اللہ کہہ کر گھر سے نکل کھڑے
ہوئے اور میدان کارزار میں پہنچ کر شامیوں پر سخت حملہ کیا اور
بہت سے آدمیوں کو قتل کر ڈالا پھر اپنے ہمراہیوں کے ساتھ
تکبیر کہتے ہوئے ہجوم اعدا میں گھس گئے بعض آدمیوں نے بھاگی

راستے دی مگر آپ نے فرمایا کیسا برا ہو وہ شخص جو ایسی حالت میں بھاگ جائے۔ میں اللہ کے فضل سے دین اسلام پر ہوں۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ قتل کر دیا جاؤنگا سو اس خوف سے بھاگنا حماقت ہے اسوقت مسجد حرام کے تمام دروازے شامیوں سے بھر گئے تھے مکہ معظمہ کی ناکہ بندی کر لی گئی تھی۔ حجاج و طارق نے ابطح کی طرف مروہ تک محاصرہ کر لیا تھا اسی عالم میں ابن زبیر ادہر ادہر حملہ کر رہے تھے۔
جب حجاج نے دیکھا کہ لوگ ابن زبیر پر حملہ کرتے ہوئے جی چراتے ہیں تو سخت غصہ ہوا اور طیش میں آکر پیادہ پا لشکر لئے ہوئے ابن زبیر کے علم بردار پر حملہ آور ہوا لیکن ابن زبیر اس نرغہ میں گھس کر اپنے علم بردار کو نکال لائے اور سخت حملہ کرکے حجاج کو پسپا کر کے لوٹ آئے اور مقام ابراہیم میں دو رکعت نماز ادا کی۔ اس درمیان میں پھر علم بردار پر حملہ کیا گیا اور وہ مارا گیا مگر ابن زبیر نماز سے فارغ ہو کر بغیر نستان و علم کے لڑتے رہے یہانتک کہ ایک ظالم و جفا کار کا تیر پیشانی مبارک پر آکر لگا جس سے تمام روئے مبارک لہو لہان ہو گیا مگر آپ اس حالت میں بھی لڑتے رہے اسکے بعد دشمن دور سے تیر برسانے لگے اور ایسی سخت سنگباری کی کہ بالآخر آپ گھوڑے سے نیچے گر پڑے اور شہید ہو گئے۔ یہ واقعہ روز سہ شنبہ جمادی الثانی ۷۳ھ کو واقع ہوا

پھر حجاج کے سامنے انکا سر پیش کیا گیا اور اسنے عبدالملک کے پاس ایک نامۂ بشارت کے ساتھ بھیجدیا۔ پھر لاش منگوائی گئی اور مقام حجُون میں مثلہ کرکے صلیب پر چڑھا دی گئی۔

ابن زبیر کی ماں اسمار مقام حجُون پر تشریف لے گئیں اور بیٹے کی لاش کو صلیب پر دیکھ ایک آہ سرد کھینچی اور ایسا دردناک مرثیہ پڑھا کہ تھر کے دل و جگر پانی ہو گئے۔ اسمار نے حجاج سے بیٹے کی لاش مانگی کہ تجہیز و تکفین کردیں مگر شقی القلب حجاج نے دفن کرنیکی اجازت نہیں دی۔

تم ابن زبیر کی دکھیا ماں کی حالت کا اندازہ کرو کہ اس بوڑھی بیوہ عورت پر کیا گذری ہوگی جسکا ایک بیٹا مصعب بن زبیر پہلے قتل ہو چکا ہے اور یہ دوسرا فرزند اسکی آنکھوں کے سامنے شہید ہوا اور اسکی بے سر کی لاش صلیب پر آویزاں ہے وہ اس دردناک نظارہ کو دیکھ رہی ہے مگر اتنی قدرت بھی نہیں کہ جسکو نو مہینہ تک پیٹ میں رکھا برسوں سینہ پر لٹایا گود میں کھلایا پھر بڑا ہوا شادی کی مگر اسوقت اسکی لاش تک نہیں چھو سکتی نہ کفن کا آخری جوڑا پہنا سکتی ہے نہ دو گز زمین کے اندر اسکو دفن کر سکتی ہے۔ بیکس و مظلوم عورت کا اسوقت کوئی نہیں کہ اسکے دکھ کو دور کرے۔ یہ عورت کون ہے؟ یہ رسول اللہ صلعم کی

بھاوج ہے حضرت زبیر کی پھوپی ہی جو رسول اللہؐ کے پھوپی زاد
بھائی تھے مگر یہ امتیازات آج اسکی کچھ مدد نہیں کر سکتے وہ جگر اوگا
بیٹے کی لاش کے لئے تڑپ رہی ہو مگر کوئی نہیں جو اسکی یہ آخری
ومختصر تمنا پوری کردے۔

ممکن ہے تم اس غریب وبیکس عورت کو بدنصیب کہو کیونکہ اس
عورت سے زیادہ بدنصیب اور کون ہوگی جسکے ایک چھوڑ دو دو
بیٹے قتل کردئے جائیں اور وہ انکی لاش تک کے لئے ترسے
لیکن نہیں تم یہ لقب دینے میں عجلت نہ کرو۔ ایسی خوش قسمت مائیں
دنیا میں کم ہونگی جیسی ابن زبیر کی بوڑھی ماں اسماء تھی۔ اس کا دل
نور ایمان سے منور تھا وہ حق وصداقت کی پرستار تھی وہ اس امر پر
راضی ہوگی کہ اس کا فرزند ظلم وعدوان کا مقابلہ کرے اور تمرد وسرکشی
کو دنیا سے برباد کردے اور اگر راہ الٰہی میں شہید ہوجائے تو اس پر
صبر کرے۔ اس کا فرزند رشید مرضات الٰہی کے پورا کرنے کے لئے
کھڑا ہوا۔ ضلالت وگمراہی دور کرنے کے لئے اس نے اپنے نفس کو
مہالک وخطرات میں ڈالا اور بالآخر خدا سے اسلام کی راہ میں اپنی
جان قربان کردی۔ پھر ایسی مائیں کہاں اور ایسے فرزند کس کو نصیب
ہوتے ہیں۔ موت نے اس کی زندگی کا خاتمہ کردیا مگر ایسا خاتمہ کہ

قیامت تک کے لئے حیات جاوید کا خلعت عطا ہو گیا اور نہ صرف صفحہ تاریخ پر بلکہ مسلمانوں کے قلوب پر اس کا دوام ثبت ہو گیا۔

عبداللہ ابن زبیر شہید ہو گئے ان کی لاش صلیب پر لٹکائی گئی اور حجاج نے وہ سب کچھ ظلم کر ڈالے جن کے ذکر سے انسان ستہ باقی ہے مگر نہ حجاج رہا نہ اس کے مظالم نہ اس کی ستمگاریاں ہیں نہ اس کا آقا عبدالملک باقی ہے سب فنا ہو گئے سب برباد ہو گئے موت نے مقتول کی طرح قاتل کا بھی خاتمہ کر دیا اور مظلوم کی طرح ظالم بھی موت کے بے اماں حربہ سے نہ بچ سکا۔

عبدالملک اپنے عہد میں دنیا کا سب سے بڑا بادشاہ، شام و روم و مصر و افریقہ عراق و ایران حجاز و عرب کا مالک تھا سیکڑوں کو پھانسی دیدی لاکھوں کے سر تن سے جدا کر دئے سیکڑوں عورتیں بیوہ ہو گئیں ہزاروں بچے یتیم ہو گئے مگر جب وقت آگیا تو ساری طاقت طاق تھی نہ زور و قوت کچھ کام آیا نہ فوج و لشکر نے ساتھ دیا نہ شوکت و عظمت نے بچایا موت کا فرشتہ آیا اور ایک مسکین انسان کی طرح اسکی روح کو بھی قبض کر لیا۔

غرضکہ ابن زبیر کا فرق مبارک عبدالملک کے پاس بھیجا اور لاش کا حال معلوم ہوا کہ حجاج نے دفن کی اجازت نہیں دی تو وہ بہت

خفا ہوا اور حجاج کو سخت ملامت کی اور لاش کے دفن کرنیکی اجازت دیدی تھی
عبداللہ ابن زبیر موت کے فلسفہ سے واقف تھے وہ اس سے بیزار
اور اسکو اپنا دشمن نہیں سمجھتے تھے انکو معلوم تھا کہ موت آئیگی اور یقینی
آئیگی اسلئے حیات مستعار کو اس طرح اسکی سپرد کرنا چاہیئے کہ دوسروں
کے لئے دلیل راہ اور خود میرے لئے باعث فلاح ہو۔ چنانچہ انھوں
نے اپنی زندگی حق و صداقت کے قرباں گاہ پر چڑھا دی۔ پھر دیکھو کہ
موت انکی دوست تھی یا دشمن۔

تبصرہ دل کی تین نظمیں خاص رسالہ "لکم ٹو موت" کے لئے سری خواہش سے آگرہ کے شہرہ آفاق
سحر ل شاعر جناب مولانا سیماب نے لکھی ہیں لیڈر کی موت میں انھوں نے
حالات و واقعات کا بے ساختہ آئینہ دکھا دیا ہے اور بکری کی موت کا بیان انکے
دل درد آشنا کی تصویر ہے جس کا ہر شعر ابن آدم کا دامن گیر ہے۔ تاکہ وہ سمجھے
کہ بقائے حیات کے لئے جو غذائیں اسکے پیٹ میں جاتی ہیں وہ کن مصائب کے
بیابانوں سے گزر کر آتی ہیں۔
شہزادہ دارا شکوہ برادر اکبر سلطان عالمگیر بادشاہ غازی کا تذکرہ شہادت نہایت
الم ناک ہے۔ اور اس سے دولت و حکومت کے نشہ رکھنے والوں کو بہت عبرت
ہوگی۔ اور ایسا انجام یاد آئیگا مگر واقعات قتل میں جناب سیماب نے یا تو شاعرانہ مبالغہ

یا شہرت عام کی بنا پر چند باتیں خلاف تاریخ لکھ دی ہیں اور نگ زیب نے
دارا کی آنکھیں نہیں نکلوائی تھیں نہ دارا کو یہ موقع ملا تھا کہ وہ بھائی کے قدموں پر
سر رکھتا - اسکو جلس جانہ میں قتل کرایا گیا - اور دھلی دروازہ پر مدتوں اس کا
سر لٹکا رہا - (جیل دہلی کے سامنے والے شہر کے دہلی دروازہ مراد ہے موجودہ
شہر کا دہلی دروازہ نہیں) حسن نظامی

۶۸۹

ایک لیڈر کی موت

یہ فرش نزع پر اک لیڈر پڑا ہوا ہے — ہونا ہی جسکو راہی ساعات متصل ہیں
ہر آن پاس اسکے سو حسرتوں کا جمگھٹ — کچھ ولولے ہیں جی میں کچھ حوصلے دل میں
کچھ کامیابیوں کا دھندلا سا ہی تصور — ہیں کچھ ندامتیں بھی آمادہ منفعل ہیں
وہ انہماک قومی، وہ انصرام ملی — جذبات جوش آگیں وہ طبع مستقل ہیں
چندوں کے وہ بکھیڑے، وہ حسرت صدارت — وہ ایڈریس ہوائی اجلاس منفصل ہیں
نشتر زن تخیل ہے واقعات رفتہ — پیدا ہوئی چمک سی ہر زخم مندمل ہیں
سوچا کہ کاش کرتا کچھ سعی آخرت بھی — ہوتا نہ یوں تجاوز اوقات معتدل ہیں
یہ وقت ہے کہ طلبی سرکار میں ہے میری — جانا پڑیگا مجھکو عقبیٰ کی کونسل میں
اعمال کی جو پرسش ہوگی تو کیا کہوں گا — خوش حالیاں ہی کیا ہیں اس کے مخل ہیں

ہیں چند سانس باقی اور وقت واپسیں ہے
لیڈر پھنسا ہوا ہے افکار مضمحل میں

دم مارنے کا موقع اب ہمدمو نہیں ہے
حقّے یہ بھر کے رکھئے گو بار جلیں

غفلت میں ہو تو جوش ہے ہشیار ہو تو ماتم
ہے انقلاب کیسا انساں کے آب و گل میں

کر لو جو کچھ ہو کرنا سر پر قضا کھڑی ہے
ایسا نہ ہو کہ حسرت رہ جائے دل کی دل میں

ایک بکری کی بے کسانہ موت

۲۸

دنیا کا یہ عبرت کدہ کس درجہ عبرت خیز ہے
ہر واقعہ درد آفریں ہر حال حسرت خیز ہے

جلوہ نما بیکسی منظر ہزاروں آہ ہیں
جو مٹ گئے بن بن کے ایسے گھر ہزاروں آہ ہیں

انساں ہی کا اس میں نہیں تنہا شکار بیکسی
ہیں جانور بھی آئے دن سینہ فگار بیکسی

یہ چھوٹی چھوٹی چیونٹیاں یہ ہی تتلیاں
یہ گائیں بھینسیں اور بھیڑیں مرغیاں اور بکریاں

پامال ہو جاتی ہے ہستی اکی انساں کیلئے
برباد ہو جاتی ہے بستی اکی انساں کیلئے

فطرت کا ہے یہ قاعدہ فطرت کا یہ قانون ہے
انسان ہی کے نام سے ہر جانور مضمون ہے

مرتا ہے جیتا ہے کوئی بھی کسی کے واسطے
اور جانور مرتے ہیں اسکی زندگی کے واسطے

حسرت اگر [illegible] بیکسی [illegible]
افسوس [illegible] پوچھے جس کا ساز بھی یہ سوز ہو

[illegible]
بے علم اپنی موت [illegible]

دو بیٹھ چھوٹے جو ماں ہیں نیچے بھی اسکے پاس ہیں
بکری کی ہیں زندگی اور اسکے دل کی آس ہیں

اپنی رسی سے جاٹتی ہی جو سہی ہی وہ انہیں
کھوٹے کے چاروں سمت لیکر گھومتی ہی وہ انہیں

اوجھل وہ ہو جاتے ہیں جب اک بار اسکی آنکھ سے
ہوتے ہیں جاری آنسوؤں کے تار اسکی آنکھ سے

الفاظ یاد اسکو نہیں فریاد وہ کیونکر کرے
اپنی زباں میں شکوہ بیداد وہ کیونکر کرے

کہتی ہی منہ سے کہ میں صابر اور مجبور ہوں
بچے جو مجھ سے دور ہیں آرام سے میں دور ہوں

سنتا نہیں لیکن کوئی فریاد اس مجبور کی
کرتا نہیں کوئی دوا اس کے دل رنجور کی

وہ سنتا بچوں کے اپنے ذبح ہونے گر
رہ جاتے ہیں بچے اشاروں سے کلیجہ تھام کر

قصاب بھی کھول کر جب دم گراتا ہی اسے
بچوں کی تنہائی کا عالم یاد آتا ہی اسے

گردن اٹھا کر دیکھتی رہتی ہی انکو بار بار
کر ڈالتی ہی ذبح اسکو چھری کی تیز دھار

کہتی ہی منہ سے ابھی کہ میں بچوں سے ہوتی ہوں جدا
میرے یتیمو ہو تمہارا حافظ و ناصر خدا

درد یتیمی یاد جب بچوں کا آتا ہی اسے
اندوہ ان کا خون کے آنسو رلاتا ہی اسے

ہوتا ہی ایسا بھی کہ بچے اکثر اسکے سامنے
ہوتے ہیں ذبح بیکسی مر کے اسکے سامنے

حالت یہ انکی دیکھ کر سودائی ہو جاتی ہی وہ
رسی تڑا نے کے لئے بے طرح گھبراتی ہی وہ

بچوں کو اپنے خون میں آلودہ بیکل دیکھ کر
مجبور رہ جاتی ہی وہ مجبور ادہر دیکھ کر

حسن یہ ہر شے کے لئے اک طرح جاتی ہی وہ
تو سکتی ہی جاتی ہے اور چلاتی ہی وہ

بیچارہ انسان کو مگر احساس کچھ ہوتا نہیں
آنسو بہا کر رہتی ہیں اسکے سامنے روتی نہیں

ہیں اسکے بچے ذبح کرا کر اسکے سامنے
یہ بیٹھ جاتے تھام کے دل آہ کر کے سامنے

بکری کی لیکن بیکسی اُس پر اثر کرتی نہیں
بے چارگی پیدا کبھی دردِ جگر کرتی نہیں

کیا ہو نہیں سکتا، نہ لائے بیچ کر بیکسی لیے
بچوں کے آگے ماں کو اور بچوں کو ماں کے سامنے

کیا ہو نہیں سکتا کہ ہو حسّاسِ حالِ بیکسی
ہونے نہ دے اس طرح اُنکو پائمالِ بیکسی

ہونے کو ہو سکتا ہے، جو چاہے کرے لیکن یہاں
موت آئے اور لائے نہ رنگِ بیکسی ممکن نہیں

کہتے ہیں جسکو بیکسی وہ موت کی تصویر ہے
فطرت کا منشا ہے یہ، انساں کی کیا تقصیر ہے

دارا کی موت

٦/٨/٩

بقا نصیب نہیں عالمِ فنا کے لئے
وہ دو دن چلنے کی خاطر نہ ہر خدا کے لئے

مسافروں کو یہ فطرت کا عام ہے اعلان
قیام کچھ نہیں اس کاروانسرا کے لئے

ملی کسی کو یہاں عمرِ جاوداں نہ کبھی
کسی نے لطف ہمیشہ یہاں نہ آ کے لئے

بنائے سدِ سکندر ہوئی بہت مضبوط
مگر نہ روک نکالی گئی قضا کے لئے

رہا کسی کو میسر نہیں رہا ہے جس
نہ بادشہ کے لئے ہے نہ ہے گدا کے لئے

جنابِ خضر کی حالت جو ہو گئی معلوم
تو آبرو نہ رہی چشمۂ بقا کے لئے

چمن رہے گا نہ باقی چمن کی شادابی
یہ سب بہار ہے دو روز کی ہوا کے لئے

جہاں ہو چین سے رہنا یہ وہ مقام نہیں
کہ دو گھڑی سے زیادہ یہاں قیام نہیں

وہ شاہزادۂ عالی تبار دارا تھا — جو روشنی تھا ہر اک دیدۂ وِلا کے لئے
تھا قصرِ شاہ میں دارا شکوہ جسکا نام — جو فخر و ناز تھا احباب و اقربا کے لئے
کنیزیں بیسیوں تھیں جسکی ہم جلیس نہیں — حسین سیکڑوں تھے ایک لقا کے لئے
تھی اسکی ٹھوکروں نے سر کی ہوئی دولت — تو اسکے ہاتھ گہربار تھے عطا کے لئے
تھا اُسکے پاس زر و مال و لال و گہر — کچھ انتہا ہی نہ تھی جنکی ابتدا کے لئے
پھر النصیب تو گردش میں آگئی قسمت — وہ سعی کرتا تھا اورنگ کے بہا کے لئے
خدا نے بھائی کو اسکے جو کامیاب کیا — تباہی آگئی اس دردآشنا کے لئے

نصیب قسمتِ دارا میں انقلاب آیا
کہ جیسے نکا خطِ تقدیر کا جواب آیا

بلایا بھائی نے جب تخت اسکے ہاتھ آیا — ملا نہ وقت بھی کچھ عرضِ مدعا کے لئے
دیا یہ حکم کہ آنکھیں نکال لو اس کی — سزا یہی ہو فقط اپنے ناسزا کے لئے
سلاخیں لوہے کی اور وہ بھی آتش افگندہ — پھر اُسپہ یہ کہ تھیں جسم سیاہ کے لئے
نکالیں ظلم سے قاتل نے شہرگیں آنکھیں — رہیں نظر میں گنجائشیں حیا کے لئے
ہوا یہ دوسرا پھر حکم اُس کے بھائی کا — کہ سر بھی اسکا جھکے خنجرِ جفا کے لئے
وہاں تو صرف بہانہ تھا اک اشارے کا — ستم ہی ٹوٹ پڑا جانِ مبتلا کے لئے
قدم پہ بھائی کے وار اپنے رکھ دیا سر کو — کہا کہ بھائی مجھے چھوڑ دو خدا کے لئے

ہوئی مگر نہ شنوائی نہ التجائی کی
سنی نہ بھائی نے آخر پکار بھائی کی

پھر ایک دربہ لٹکوا دیا سر دارا — کہ ہو تماشۂ عبرت میں تشنہ کے لئے

یہ حال اُن کا ہے جو صاحبِ حکومت تھے — نصیب جن کا تھا ایوانِ خسرویا کے لئے

جب اُنکے ساتھ یہ قسمت نے نارسائی کی — تو پھر کہاں ہے مفر اور اغنیا کے لئے

نہ کام آئی حکومت، نہ منصبِ شاہی — نہ مال و زر نے دیا ساتھ [illegible] کے لئے

اگر ہے چشمِ بصیرت تو ہے عیاں یہ بات — ثبات کچھ بھی نہیں بے وفا کے لئے

ہر ایک نفس کو چکھنی ہے موت کی لذت — ہزار ہاتھ اٹھا کرے دعا کے لئے

فنا ہے سارا زمانہ، فنا ہے آخر کار — رہا جو ہے تو فقط ذاتِ کبریا کے لئے

رہیں گے پھر نہ یہ پھولوں میں رنگ و بو باقی

رہے گا اس میں معبود ایک ہی باقی

موت

آہ تیرا نام لیتے ہی کلیجہ منہ کو آتا ہے طبیعت ہر ایک کام سے بیزار ہو جاتی ہے اور ایک دفعہ ہُو کا عالم ہو جاتا ہے۔ اے موت تو کیا ہے؟ تیرا کیا کام ہے؟ کہاں کہاں تو منزل پر پہنچانے کے لئے رہنما ہے تیرا کام ایک دنیا سے دوسری دنیا میں لے جانا ہے۔ اے موت تو ہر جگہ ہے تیری حکومت ہر جگہ پھیلی ہوئی ہے خشکی اور تری اور جنگل اور صحرا سب جگہ موجود ہے، کوئی بادشاہ سے بغاوت کر سکتا ہے

برتیری حکومت ایسی ہے کہ بغاوت کیا بلکہ کوئی شخص بھی نظر اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا بادشاہ تو اپنی ہی قوم کو ایک نظر سے دیکھتا ہے پر تو ہے کہ سب پر نظر یکساں ہے نہ تو کوئی امیر اپنی دولت کی وجہ سے رہائی حاصل کر سکتا اور نہ غریب اپنی غربت سے بچ سکتا ہے۔ تو عجب بہروپیا ہے کہ ہزاروں شکلوں میں اپنے شکار کے روبرو جلوہ نما ہوتی ہے کبھی تو سانپ کبھی ہیضہ اور کبھی کیا کبھی کباب بن کر آدمی کی روح کو اس کے قفس عنصری سے کھینچ لیتی ہے چاند ستارے آفتاب وغیرہ اپنے معین وقت پر نکلتے ہیں سب کا ایک وقت ہے لیکن تیرا اے موت کوئی وقت نہیں تو وقت کی پابندی کا ذرا بھی لحاظ نہیں کرتی ڈاکٹر اور حکیم تیرے کام میں خلل ڈالتے ہیں لیکن واہ رے موت! تو ان کو بھی نہیں چھوڑتی دنیا میں شاید ہی کوئی مخلوق ایسی ہو کہ تیری چاہنے والی نظر آئے۔ ایک شخص اپنی گاڑی چلا رہا تھا راستہ میں بہت کیچڑ ہونے کی وجہ سے اس کا پہیا اس میں دھنس گیا وہ نامراد بغیر کوشش کئے خداوند کریم سے اپنی موت کا خواستگار ہوا کوئی نوجوان شخص وہاں سُن رہا تھا اسکے سامنے حاضر ہو کر کہا کہ تو کیا چاہتا ہے اُس نے کہا کہ میری گاڑی کو باہر نکال دے وہ شخص بہت ہنسا اور کہا کہ ابھی تو موت چاہتا تھا اور ابھی مدد۔

اُف ۔موت! تو نے کیسے کیسے پری جمالوں کو گور کی تاریک و تنگ کوٹھری میں سُلا دیا کہ پھر کروٹ لینے کا نام ہی نہیں۔ ہائے جن کے محلوں میں ہمیشہ چہل پہل رہتی تھی آج انکو تن تنہا رکھ چھوڑا ہے۔ آہ اس بچہ کو جسنے ماں کی گود سے کبھی بھی سر تک نہ رکھا تو نے گود سے زبردستی چھین کر خاک کے ڈھیر میں چھپا دیا۔ اُف ایسے ایسے امیرزادے جن کو پھول کی سیج پر بھی جلد نیند نہیں آتی تھی وہ بھی خاک پر ایسے بے خبر سوئے ہیں کہ جاگنا قسم ہے۔ ہاں اگرچہ تجھ سے سب کوئی گریز کرتے ہیں لیکن تو نہ ہو تو پھر زندگی کا لطف نہ ہو اور دنیا میں تمام پیر سُست ہو جائیں۔ اے موت تجھے تو اس باغ دنیا سے ایسا پھول توڑنا چاہئے کہ جس کی پتّیاں اپنی سال پیمائی کی وجہ سے پژمردہ ہو چکی ہوں نہ کہ وہ کلی جو ابھی کھلنے بھی نہ پائی ہے اور ہزاروں آنکھیں جس کے جلوہ کی امید میں مصروف نظارہ ہوں۔

گورستان ۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں موت یاد آجاتی ہے۔ ہر چہار جانب جو زمین اُٹھی ہوئی ہے اس میں تمام دہقان مٹی کے غلاف سے اپنے آپکو پوشیدہ کر کے ایسے سوئے ہوئے ہیں کہ باد صبا اور صبح کی اذان بھی انکو بیدار نہیں کر سکتی۔ ہائے اس میدان میں کیسے کیسے نوجوان اور پری جمال تن تنہا اپنے اپنے حجرہ میں پناہ گزیں ہیں اور ان لوگوں کا

دیکھنے والا سوائے خدا کے اور کوئی نہیں ہے۔ اے زمیں تو بڑی رحیم ہے اور تو شاہ و گدا کے ساتھ ایک ہی سلوک سے پیش آتی ہے

از نظام المشائخ　　محمد جنید سلیم پوری

موت اکبر کی نشانی

یہ خوابگاہ اُس بادشاہ جلال الدین اکبر کی ہے جو رجب ۹۴۹ھ میں ست یکشنبہ کو بطن حمیدہ بانو بیگم زوجہ نصیر الدین ہمایوں سے پیدا ہوا تھا اور جسے ۱۳ سال ۸ ماہ ۲۷ دن کی عمر میں تاج و تخت ملا تھا۔ ۲ شعبان جمعہ کو آگرہ سے پیادہ پا اجمیر شریف ہو کر دہلی واپس آیا تھا۔ اور دہلی سے شکار کھیلتا ہوا ۱۳ جمادی الثانی ۱۰۱۴ھ روز چہار شنبہ کو آگرہ میں آ کر رہرو ملک بقا ہوا۔ یہ نادر روضہ جلال الدین اکبر نے اپنی حیات میں بنوا کر بہشت آباد نام رکھا تھا۔ دروازہ روضہ کا اس قدر بلند کہ عنقائے نظر اپنی بے پروبالی و نارسائی سے محجوب۔ یہاں باغ بھی ہے سنگ مرمر کی جالیاں اور پھول بوٹے اپنی نزاکت کے لحاظ سے ایسے ہیں گویا مصوّر نے صفحہ قرطاس پر گلہائے سر سبز کی جھاڑیاں بنائی ہیں۔ اوپر کا تعویذ سنگ مرمر کا محض زیارت گاہ عام ہے اور نود و نہ نام اُس پر کندہ۔ نیچے کے تہ خانے میں وہ اصلی تعویذ ہے جس میں وہ جلیل القدر بادشاہ تنہا سو رہا ہے جو کل قلعۂ سرخ

اور اقلیم ہند کا مالک تھا۔ ہائے نہ سہرا لے سکے آج کوئی شمع ہے نہ وہ فیضی
و ابوالفضل سے عالی مرتبہ ندیم و ہمنوا (مخمس عرش بر شعر داغ)

ایک چادر کفن کی جسکو اوڑھا ہوں پڑا ۔۔۔ اب نہ وہ ہمدرد و ہمدم ہیں کوئی دوسرا
کس سے پوچھوں وہ طلسم رنگ و دنیا کیا ہوا ۔۔۔ زندگی میں پاس سے دم بھر نہ ہوتے تھے جدا
قبر میں تنہا مجھے یاروں نے کیونکر رکھ دیا

اے اجل نہ قہر یہ غضب کہ تو نے ایک شخص کو اکہ سارے زمانہ میں سے
جلال الدین اکبر سے رنگین طبع عالم دوست بادشاہ کو چھین لیا۔ اور چھین کر
ایک ایسے تاریک قید خانے میں بند کر دیا جہاں کسی طرح ہم نہیں جا سکتے
آہ۔ یا تو وہ وقت تھا جب اکبر قلعہ سرخ کے عالیشان دروازہ سے
شان شاہانہ کے ساتھ نکلتا تھا یا آج وہ وقت آیا ہے کہ اسی دروازہ
سے اُس کا حسرت بھرا جنازہ نکل رہا ہے۔ ہے ہے عشق کا دم بھرنے والی انیوں کا
واویلا آسمان کو سر پر اٹھائے ہوئے ہے اور زبانِ عبرت پر مومن کا
یہ نوحہ ہے کہ

مدفن ہے زمینِ چمن وا مصیبتا ۔۔۔ معدوم ہو وہ غنچہ دہن وا مصیبتا
دے منکر و نکیر کو ناچار وہ جواب ۔۔۔ جو جور سے کرے نہ سخن وا مصیبتا
جسکو شکستنِ دلِ عاشق عذاب ہو ۔۔۔ وہ اور جانکنی کے محن وا مصیبتا
تشبیہ آئینہ سے جو ہوتا تھا آب آب ۔۔۔ ملجائے خاک میں وہ تن وا مصیبتا

دیتے تھے جو روش بھی جس آرامِ جان کا — اُس کا غم ہلاک ستدن و مصیبتا

کیا اعتبار دہر کا عبرت کی جا ہے یہ

عشرت سرا کبھی کبھی ماتم سرا ہے یہ

از نظام المشائخ
دہلی

۴۸۶

یادِ اجل

میں اے اجل ہوں تیرا امیدوار کب سے — تیری مفارقت میں ہوں بیقرار کب سے

ہے میری جان آ جا تجھ پر نثار کب سے — کرتا ہوں آہ تیرا میں انتظار کب سے

مجبور و مضطرب ہوں بے اختیار ہوں میں — اے مرگ تیری خاطر سینہ فگار ہوں میں

اے پُر ز ناز و نخوت اے آن بان والی — اے غم فروشِ عالم اونچی دکان والی

اے صاحبِ رعونت برتر نشان والی — شرم و حیا کی دیوی شاہانہ شان والی

جاں تیرے خیر مقدم کو ترستا ہی ہے لب پر — دل کب سے تیرا رستہ تکتا ہے او ستمگر

اے موت بندِ ہستی سے تو چھڑا دے مجھکو — آزاد کر کے اپنا بندہ بنا دے مجھکو

صہبائے بیخودی کے ساغر پلا دے مجھکو — آ حجرۂ لحد میں چل کر سلا دے مجھکو

اے قہر موت ہی سے ہے وصل کا اک امکان — آ تو دل میں پیارے شفقت تیری قربان

میں ہوں فقط اکیلا کچھ مال ہو نہ زر ہو — وہ گھر کا اک کفن ہو کچھ اپنے پاس گر ہو

کھٹکا نہ رہزنوں کا چوروں کا کچھ نہ ڈر ہو — شادی کی کچھ خبر ہو غم کا نہ کچھ اثر ہو

وہ دن کب آئینگے جب احباب بار رو ہونگے — ہم اپنا سر لپیٹے بے فکر سو رہے ہونگے

غربت کی ہو نہ پروا دولت کی ہو نہ حاجت — عزت کی ہو نہ خواہش ذلت سے ہو نہ نفرت
اعدا سے ہو نہ کینہ یاروں سے ہو نہ اُلفت — اولاد کی محبت ماں باپ کی نہ چاہت
محفوظ ہوں غرض ہم ان ساری آفتوں سے — بے فکر و مطمئن ہوں دنیا کی کلفتوں سے
ہم جانتے ہیں لیکن اے موت تیری خصلت — مکّار بے حمیّت بدچشم بے مروت
تو کب نکلنے دیگی دل کی ہماری حسرت — ہے بیوفائی تیری معمولی ایک عادت
تجھ سے اماں جو مانگے آ کے گلے لگے تو — جو دل سے تجھکو چاہے اس سے الگ رہے تو

از نظام المشائخ

سکندر کا جنازہ

مشعل بزم حکومت فاتح روئے زمین — والیٔ بابل سکندر نامور شاہِ جہاں
چھوڑ کر ساز طرب جب راہیٔ عقبیٰ ہوا — آرزوئیں رہ گئیں سب ساتھ ملتی ہاں کی یاں
نعش یوں تابوت زریں میں رکھی جانے لگی — جس طرح دُرج صدف میں ہے دُرِ یکتا نہاں
بزم ماتم کا سماں عبرت فزا سین تھا — گرد تابوت سکندر سب کے سب تھے نوحہ خواں
بھر کے آہِ سرد بولا اک حکیم نکتہ سنج — مرنے والو مرنیوالے کیلئے کیوں ہو فغاں
ہے مقدم اور موخر کا یہاں بعدِ فراق — ورنہ جانیکو اسی منزل سے ہے ہر کارواں
رہرو ملک عدم کا ہے مگر نقش قدم — ساکن معمورۂ ہستی کو عبرت کا نشاں
وائے حسرت مرگ نے مجبور اس کو کر لیا — کل جو اپنے دشمنوں کو قید کرتا تھا یہاں
ہے اسی سلطان کا یہ جسم بیجان ناظرین — جسکے قدموں سے لگی تھی فتح و نصرت عز و شاں

نکتہ سنجو اتم میں کچھ بھی حسِ عبرت ہے اگر
نذرِ غم نقدِ تحمّل اب کرو مرحوم پر

حکیم ثانی تابوت پر ہاتھ رکھ کر:—

سیم و زر صندوق میں جو بند رکھتا تھا کبھی
آج خود وہ شاہِ معظم ساکنِ تابوت ہے
زندگی سے فتح کر کچھ عالمِ اسباب کو
کاہلی بھی آدمی کے واسطے اک موت ہے
جی سکندر کی طرح اور مر سکندر کی طرح
ذکر رہ جائے ترا گھر گھر سکندر کی طرح

حکیم ثالث

جائے عبرت ہے جو کل غالب تھا سب پر آج وہ
ہو گیا مغلوب کیسا بیکسی کے ہاتھ میں
سرکشوں کو ضعف جسکے عہدِ دولت میں تھا
رنگ رلیاں کر رہے ہیں وہ خودی کے ساتھ میں
موت کر دیتی ہے کیسی ایک دم کایا پلٹ
نیستی سے سارے استحکام ہو جاتے ہیں ہٹ

حکیم رابع

یہ وہ صالط تھا خیالِ مرگ کو جسنے نہاں
دل کے پردہ میں رکھا اور آرزوئیں آشکار
پھر قضا کو کیوں نہ ٹالا اور کچھ دن کے لئے
تاکہ بر آتی تمنائے دلِ بے اختیار
ورنہ امیدوں کو رکھنا چاہئے تھا مختصر
دست رس موت سے تاکہ نہ ہوتیں سوگوار
عمر کھوتا ہے بشر امیدِ ناحق کے لئے
چشم وا رکھتا ہے شوقِ دیدِ ناحق کے لئے

حکیم خامس

کشتۂ فکر و تردد تیری سعیِ ناسپاس
کا نتیجہ بعد تیرے کھل گیا یعنی کہ یاس
احتیاجِ ناسزا نے عمر بھر رکھا ذلیل
جسم فانی کا نزد و عارضی تھا تیرا پاس
بارِ غم بے جسکے سمجھے بے وفائی کی صبح
اور حاصل اس کا لاحاصل گیا ہوں کا ہراس

غیر کا حصہ ہوا سرمایۂ ہستی ترا — اور جواب عصیاں کا ایسے آئے تو دیئے چلا

حکیم سادس

ایک تجھ پر قصا تو ناصح مستحق بھی تھا — یاد ہیں اکثر تری ہم کو نصائح دلپذیر

تیرا مر جانا مگر ہی آج اک پند بلیغ — زندگی ہے اسی عبرت خیز کب ہی تھی خبر

تو سراپا پند خاموشی ہی سب کے سامنے — چشم عبرت آج عبرت کا تماشا دیکھ لے

حکیم سابع

کل تری تقریر سے مجلس میں اکثر تھی حریں — چاہتی تھی جلد تو خاموش ہو جائے کہیں

آج ہی آنکو تمنا لول اُٹھنے کی ترے — اور تو چپکا ہی یوں گویا زباں منھ میں نہیں

لگ گئی مہرِ خموشی کیوں لبِ اعجاز پر — کیوں ہیں چپ ہی ہی مصر زبان اسرار پر

حکیم ثامن

ہر سے حشر کتنی جانیں ان سامنے آئیں — تو رہے زندہ سلامت اور ترا عز و جاہ

بچ سکا لیکن نہ تو دستِ اجل سے تیر کی — آرزو ہی رہی گیا اے جانِ عالم آہ آہ

اک سطح پر خادم و مخدوم دونوں آ گئے — جاں نثار جانِ جاناں جان کھو کر آ گئے

حکیم تاسع

حکم تھا مجکو بہت دم کہ کر میں تجھسے جدا — لیکن اب تجھ تک رسائی کی نہیں پاتا ہوں راہ

میں ابھی قائم ہوں اپنے عہد پر اور تو نہیں — میرے آقا کیا یہی ہوتا ہے وعدہ کا نباہ

حکیم عاشر

کم نہیں دن طلوع صبح محشر سے ہاں — جب تلک ہستی عالم ہے رہے گا یادگار

جا بسے جاتے آج کے حرمانِ غم بھر آ گئے — آیوالی برکتیں اس دن کی ہوئیں سوگوار
ہے لہذا مُردۂ عبرت ہر ایسی آنکھ کو — جو زوالِ سلطنت پہ ہو کسی کی اشکبار
آج روئے شاہ اور شاہی کا منظر دیکھکر — تخت کا مالک پڑا ہے تختۂ تابوت پر

از اسوۂ حسنہ میرٹھ — انوار حسن رسوا

سکندر کا تابوت حلقۂ فلاسفہ میں

نتیجۂ فکر لسان الہند حضرت عزیز لکھنوی

شہر بابل میں سکندر نے کیا جب انتقال — جتنے تھے وابستۂ دولت ہوا ان کو ملال
وہ وفورِ غم دلِ اربابِ دولت سے اٹھا — صبح ہوتے ہی جنازہ شان و شوکت سے اٹھا
چھا گیا وابستگانِ اس دولت کا غم — ابرِ تیرہ بن گیا سلطان کی فرقت کا غم
ہو گیا تیار تابوت مرصع زر نگار — رکھ دیا پیکر سکندر کا بچشم اشکبار
یوں حکیمان اولوالعزم آئے ماتم کیلئے — تھے کشادہ سب کے سینے بارِ غم کیلئے
بیچ میں تابوت تھا اور گرد تھے حلقہ زن — ایک اُن میں سے ہوا اس طرح سرگرمِ سخن
بولے معلوب اک رہا ہو کو کہا اے بادشاہ — موت کو مغلوب کرنیکی نہ نکلی کوئی راہ
دوسرے نے پھر کیا تابوت سے یہ ہی خطاب — اے خدیو معدلت گستر تہ گرد دل کباب
تیرا حصہ پر اغلط اک موت کھائے شہنشاہ — موت پر آیا یہ غصہ تجھکو کیوں اے بادشاہ
تیسرے نے عرض کی اے بادشاہ نامدار — چلتی پھرتی چھاؤں بھی یہ ہستی بے اعتبار
ہاتھ رکھ کر عرض کی چوتھے نے تابوت سے — کتنی جلد اٹھا ہی تو اس محفل ناسوت سے

صحن عالم میں جو کل تک تھی ترے زیر نگیں
سات بالشت اب سمٹ کر رہ گئی ہے وہ زمین

پانچویں نے عرض کی اے بادشاہ باوفا
تو نصیحت ہمکو کرتا تھا جہاں میں بارہا

اے سکندر لیکن اب واقعی عبرت ہو گئی
آج مرنے سے ترے پوری نصیحت ہو گئی

کی چھٹے نے عرض جو کل تک مطیع و رام تھے
ہیبت شاہنشہی سے رعشہ براندام تھے

آج ہیبت سے تری کوئی خمیدہ سر نہیں
سامنے تیرے کھڑے ہیں مطلق انکو ڈر نہیں

ساتواں بولا کہ تھی تیری جدائی ناگوار
آج پہنچوں کس طرح تجھ تک ہماری تھی پکار

آٹھویں نے عرض کی دیکھو حکیم علما
ایک دم میں مٹ گیا اس دبدبے والے کا وقار

کی نویں نے عرض جب دنیا کا یہ انجام ہے
ترک اس کو پہلے ہی کر دیجے میں آرام ہے

عرض کی دسویں نے اب عالم سے شکوہ کیوں بھلا
تنگ ظرفوں میں ترے ہو قبر تنہا کیوں بھلا

تجھکو اس تابوت میں خاموش کیوں پاتے ہیں ہم
چار دیواری میں شہروں کی ترا گھٹتا تھا دم

روح نے چھوڑا ہے کتنی جلد پنجرا کی قفس
یوں گئی تنہا ہی جس طرح اڑتی ہے مگس

خلق مشتاق زیارت اور تو روپوش ہے
گوش بر آواز دنیا اور تو خاموش ہے

کیوں نہ رکھا تو نے امیدوں کو اپنا مختصر
دستبرد موت سے ہر تا مہ تجھکو کچھ خطر

بستیاں آباد تھیں جتنی وہ ویراں ہو گئیں
دیکھتے ہی دیکھتے خواب پریشاں ہو گئیں

امیر کی موت اور فقیر کی موت

دولتمند جو مرتا ہے
روتا ہے اور غم کرتا ہے

ہائے میں دنیا چھوڑ چلا ۔ مال سے ناطہ توڑ چلا
اور فقیر کو کیا ڈر ہے ۔ مرنا جینا برابر ہے
خالی آئے چلے خالی ۔ پچھلوں کا اللہ والی
ہے یہ نبی کا فرمودہ ۔ مَوْتُ الْفُقَرَاءِ رَاحَۃٌ

۴۸۶

زندگی کی ہچکیاں

حضرت اکبر الہ آبادی کی قلم سے

کتاب کم ٹو موت تیار ہو چکی تو مجھے اتفاقاً خیال آیا کہ اس میں لسان العصر وحدان الملت حضرت مولانا سید اکبر حسین صاحب الہ آبادی کا کلام کچھ نہ لکھا گیا حالانکہ انکی تحریریں عبرت و نصیحت کی جان ہیں۔

ارادہ ہوا التماس نامہ تحریر کر کے کچھ منگاؤں مگر دل نے کہا ان کو حوادث ایام نے روز روز کی علالتوں نے اور کبر سنی نے فرمائشوں کی تعمیل سے اوبھا کر دیا ہے۔ ایسی حالت میں تکلیف دینی مناسب نہیں۔

اُٹھ کر الماری میں سے کلیات اکبر حصہ دوم نکال لی۔ اور اس کو سرسری نظر سے دیکھا تو حسب ذیل اشعار تھوڑی دیر میں نکل آئے۔

سالہا سال سے میں یہ کرامت کلام اکبر کی دیکھ رہا ہوں کہ جب کبھی کسی خاص مضمون کے لئے کلیات اکبر کو دیکھا تو ایسے شعر فوراً مل گئے گویا وہ میرے ہی مقصود کے واسطے لکھے گئے تھے۔

ناظرین ملاحظہ کریں کہ یہ اشعار کم و بیش مقصود کے کس قدر موافق ہیں گویا اگر اور مضامین اس کتاب میں نہ ہوتے اور صرف یہی منتخب اشعار لکھ دیئے جاتے تو میرا مقصود حاصل ہو جاتا اور دلوں پر ہر پہلو سے موت کی حقیقت طاری ہو جاتی ہیں لیے اس کتاب میں مختلف حالتوں کے نظارے موت کے متعلق دکھائے ہیں اگر ان اشعار کو غور سے پڑھا گیا تو معلوم ہو جائے گا کہ اس مجموعہ اشعار میں کوئی شعر ایسا نہیں جو مضامین نثر کے کسی نہ کسی حصہ کا عنوان بنانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو

کاش اس وقت میرے پاس کلیات اکبر کا حصہ اول بھی ہوتا اور اس کا انتخاب بھی اس کتاب میں آ سکتا۔ شاید خدا تعالیٰ آئندہ اڈیشن میں یہ توفیق اور موقع عنایت فرمائے۔

حسن نظامی

زندگی کی چمک سے دیدۂ عبرت ہی بند | کم نظر ہی جانب گورِ غریباں ہی نوں
ہو او ولیوشن[۱] بس اک تفسیر العالمین | کاش اس کی تہ تک دیکھ لیں مسلماں ان کا راز
بن علیہا فان ہی پر ختم ہی قولِ تناسخ[۲] | کیوں عبث برپا ہی اتنا شور مسلماں ان کا راز

جنکے جلوے نہ سما سکتے تھے ایوانوں میں | انکی خاک آج پڑی پھرتی ہی ویرانوں میں
کاش یہ ہوس کو الجھایا ہی افسانوں میں | آنکھ نے دل کو بہت سا رکھا ہی ارمانوں میں

---

[۱] ارتقا [۲] مسئلہ تناسخ بدشمار

جانتے ہیں کہ اجل سر پہ کھڑی ہے لیکن　　محو ہیں انجمنِ دہر میں خوش بیٹھے ہیں

عقل حیران ہے پروانوں کی اس حالت پہ　　شمع کو جس میں یہ جاں دے دیتے ہیں

چاہتا ہوں میں کہ خواہش موت کی اچھی نہیں　　زندگی بے لطف ہو جائے مگر تو کیا کروں

کتنی باتیں ہم اس دورِ فنا میں ہو چکیں　　ابتدائیں کتنی راحل انتہائیں ہو چکیں
سوچ تو دل میں تو اے مصروفِ حالِ صبح و شام　　کتنی صبحیں ہو چکیں اور کتنی شامیں ہو چکیں

کسی کو یاں بقا نہیں کوئی سدا رہا نہیں　　یہاں کا رنگ ہی یہ ہے تو کچھ گلا نہیں
غرور تھا نمود تھی - ہٹو بچو کی تھی صدا　　اور آج ہم سے کیا کہوں لحد کا بھی پتا نہیں

آرزو مرگ کی تم کرتے ہو اکثر لیکن　　سوچ لو قبر میں آرام ملے گا کہ نہیں

شیخ ڈرتے ہیں کہیں منہ سے نکل جائے مرا　　اس لیے جبہ سے کم رکھتے ہیں ایسے لقے

پیچیدہ زندگی کے کرو تم مقدمے　　دکھلا ہی دے گی موت نتیجہ نکال کے

دلکش صدائے صور تو ایسی نہ تھی مگر — تعظیم حشر کے لئے سب اُٹھ کھڑے ہوئے

تیز رفتار نہ ہو اس قدر اے موج فنا — تجھ میں کچھ قطرے ہوا سے ہیں اُبھرنے والے

کیوں نہ لوں نام خدا اس بت کی صورت دیکھکر — لوگ کہتے ہیں کہ کلمہ پڑھ کے مرنا چاہیے

کیسے کیسے زرنگار ایواں ملے ہیں خاک میں — ریزہ ریزہ اب بھی ویرانوں میں اطلس پوش ہے

مٹ رہا ہوں شوق سے دنیا کے قصوں کو مگر — دیکھئے رہتا ہو جسم داستاں کب تک بچ سکے

وقتِ طلوع دیکھا وقت غروب دیکھا — اب فکر آخرت ہے دنیا کو خوب دیکھا

شکر ملا جسکو رلانے میں مبارک ہو اُسے — ہم نے تو کچھ بھی نہ پایا غم و حسرت کے سوا
مطمئن ہو کے لگاتا ہوں لحد میں بستر — اب اُٹھاتا ہے مجھے کون قیامت کے سوا

فرقت یار میں جینے کا سہارا کیا تھا — موت بھی موت سوا موت کے چارا کیا تھا
جان اللہ نے لی جسم ہوا داخل گور — ہم نے بھی دل میں یہ سمجھا کہ ہمارا کیا تھا

دنیا کا دیدنی وہ تماشا نکل گیا　　اب گرد رہ گئی ہے یہ میلا نکل گیا
موت آئی عشق میں تو ہمیں نیند آ گئی　　نکلی بدن سے جان تو کانٹا نکل گیا

کام کوئی مجھے باقی نہیں مرنے کے سوا　　کچھ بھی کرنا نہیں اب کچھ بھی کرنے کے سوا
موت سے ڈرتے ہیں اب پہلے یہ تعلیم تھی　　کچھ نہیں آتا تھا اللہ سے ڈرنے کے سوا

برباد کیا اجل نے مجھ کو کیا؟ یہ کہئے　　روح رواں سنے لیے دامن کو جھاڑ ڈالا

جو دیکھی ہسٹری اس بات پر کامل یقیں آیا　　اُسے جینا نہیں آیا جسے مرنا نہیں آیا

جاں ہی لینے کی حکمت میں ترقی دیکھی　　موت کا روکنے والا کوئی پیدا نہ ہوا

ہر اک کو موت کا اک دن پیام آئیگا　　خدا کا نام لیتے جاؤ کام آئیگا

غالباً خاتمہ بالخیر سمجھ لو اس کا　　جسکے مرنے کا کسی نے بھی غم نہ کیا

قبروں سے دوستوں کے بکھرے ہیں سو اُدھر　　لوں کیسے نام روؤں میں کس کس نشاں پہ

ہر قطرہ اور ذرہ ہے مورد حوادث — دفتر ترا کہاں تک اے زر رقم کہاں تک
شخصی ہوں خواہ قومی سب آیتیں ہیں فانی — کبر و غرور کب تک جاہ و حشم کہاں تک
کہتے ہیں دوست اکبر کو دیکھ کر بحسرت — ہے اس کا دم غنیمت لیکن یہ دم کہاں تک

غافلوں کو جلوۂ ہستی بہارِ عید ہے — چشمِ بینا میں مگر یہ مرگ کی تمہید ہے

خوشی ہے سب کو کہ آپریشن میں خوب نشتر چل رہا ہے — کسی کو اس کی خبر نہیں ہے مریض کا دم نکل رہا ہے
یہ دیکھتے ہو جو کاسۂ سر غرورِ غفلت سے کل تھا مملو — یہی بدن ناز سے پلا تھا جو آج مٹی میں گل رہا ہے
سمجھ ہو جس کی بلیغ سمجھے نظر ہو جس کی وسیع دیکھے — ابھی یہاں خاک بھی اڑے گی جہاں یہ قلزم ابل رہا ہے

اکبر مریض ہے تو دعا بھی اسے سکھاؤ — ایسا نہ ہو کہ صرف دوا ہی کا ہو رہے

دم بھر میں جسم و روح کا قصہ تمام تھا — مٹی میں مل گیا وہ یہ اپنے وطن گئی

دنیا میں بھی مست اثرِ لغزشِ کُن ہے — پردیس میں ہے روح مگر دیس کی دھن ہے

دنیا کیلئے ہنگامے تھے خلق ایک طرف آپ ایک طرف — اب شہرِ خموشاں عالم ہو مٹی ہے لحد کا کونا ہے

رو رہے ہیں دوست میری لاش پر بیٹھے ہوئے — یہ نہیں دریافت کرتے کس نے اسکی جان لی

اجاڑ ہیں کل تخت پہ تھے زیست کی لذت وہ بھی — اللہ کی قدرت یہ بھی ہے اللہ کی قدرت وہ بھی تھی

حسرت میں ختم ہو گئی انتہائے زندگی — حل ہو سکا نہ ہم سے معمائے زندگی
اس زندگی سے خود ہی کیا ہے تجھے امیر — تجھکو یہ کیوں ہے شوق و تمنائے زندگی

جھک کر یاد کر لیتا ہوں اسی موت کو — حاضری ہو جاتی ہے اللہ کے دربار کی

مفتون ہو گئے ہم اس بے بقا چمن کے — آنکھوں میں خاک ڈالی مٹی کے پھول بن کے
ہستی کو اپنی سمجھیں بنیاد اپنی وہ کیا ہیں — اٹھے جو ہیں بگولے برباد ہوں گے بن کے
گو بچی بہت ہے اس میں فریاد بیکسوں کی — ٹکڑے اڑیں گے اک دن اس گنبد کہن کے

روح کہتی ہے کہ روٹھی تجھ سے جاں — جسم کہتا ہے سنبھالی جائے گی
زندگی کی کل ہے پیچیدہ تو جسم — سانس لے لے کر چلا لی جائے گی

جس کو تمنا نہیں ہے وہ دلکشا ہمیں ہے — جس کو رضا نہیں ہے اس کا یہاں نہیں ہے

مسرت ہوئی ہنس لئے دو گھڑی — مصیبت پڑی رو کے چپ ہو رہے
اسی طور سے کٹ گیا دورِ زیست — سُلایا شبِ گور نے سو رہے

دوزخ کے داخلہ میں نہیں اُن کو عذر کچھ — دو لٹو کوئی لگا دے جو اُن کا بہشت میں

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے — بی۔ اے ہوئے نوکر ہوئے پنشن ملی پھر مر گئے

سنتا ہوں قبر مری ریل میں آ جائیگی — خود مٹا ہوں جب اسی راہ میں ملبہ بھی سہی

زندگی بھی ہی مصیبت موت بھی برباد ہے — کس قدر اس دور میں بگڑا ہوا ہر دن ہے
ماسٹر ہیں شرع میں لڑکوں کی سعادت دیکھئے — اُن کا وہ ٹوٹ لیتے ہیں پڑھے ہیں سین ہے

سناؤں آپ سے مرنیکے بعد کیا ہوگا — پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

ہوا آج خارج جو میرا سوال — کہا میں نے صاحب سے با صد ملال
کہاں جاؤں اب میں ذرا یہ بتاؤ — وہ جھلا کے بولے جہنم میں جاؤ
یہ سن کر بہت طبع غمگیں ہوئی — مگر اس تصور سے تسکیں ہوئی
کہ جب اہل یورپ میں بھی ذکر ہے — تو بیشک جہنم بھی ہی کوئی شے

نقش ماضی منظرِ بے معنی و مبہم ہے   مصلحت فطرت کی ہے یا وہن کا مقسوم ہے
بہ رہا ہے لاکھوں ہی موجوں میں یہ بحرِ فنا   وِرد کے قابل فقط یا حیّ یا قیوم ہے

نہ پھیلا پاؤں تو اتنا حیاتِ چار روزہ میں   سمجھ لے قبر میں تیرے لیے جا صرف دو گز ہے

ابھرا ہے رنگ سودا دیوانگی بھری ہے   ہے جوشِ موسمِ گل جو پھول ہے پری ہے
شمع اور پتنگ سے ہے ہر صبح وعظِ عبرت   یہ بھی مرے پڑے ہیں وہ بھی بجھی پڑی ہے

روح کا بیجا سا ستے بڑا سائیں ہے   اس لیے ہادیِ دیں مطلوبِ حق شناس ہے

یہ جو ہنگامۂ تزئینِ عشق و کامرانی ہے   تماشا سا غافلوں کا آج ہے کل اک کہانی ہے

بعد مردن کچھ نہیں یہ فلسفہ مردود ہے   قوم ہی کو دیکھئے مردہ ہے اور موجود ہے

عزت کو موت   ۲۸۶

موجودہ زمانہ میں خود مختار بادشاہ صرف چار تھے۔ اور ان چاروں کی عزت آسمان کا تارہ بنی ہوئی ساری دنیا میں چمکتی تھی مگر خدا تعالیٰ نے

دکھا دیا کہ اس عزت کو بھی موت آیا کرتی ہے اور عزت کے طلبگاروں کو
اس انجام سے ڈرایا کہ جنکی عزت میں کروڑوں آدمی جھکے ہوئے تھے
جب وہ آن کی آن میں ملیا میٹ ہو گئی تو تم اس فانی عزت کی طلب
میں آخرت کے اعزاز باقی کو کیوں بھولے جاتے ہو۔

موت ہر چیز کو آتی ہے اور عزت کی موت سب موتوں سے بڑھ کر دردناک ہے
کیونکہ عزت کی خاطر انسان جان دینی گوارا کر لیتا ہے کسی شاعر نے کہا ہے

حشمت مٹے جلال مٹے کر و فر مٹے   مال و منال سارا مٹے گھر در مٹے
سب جائیں مٹ بلا سے پر نام رہ جائے   اور آبرو کے جیتے جی انسان رہے

لیکن اللہ تعالیٰ نے قرار دیا ہے کہ عزت فقط خدا کی ذات کو سزاوار ہے۔
آدمیوں کی عزتِ خام و عزتِ ناقص ہیچ ہے۔

دیکھا ان دو چار سالوں میں لگا تار کیسی کیسی
عزتوں کے تاج تاراج

ہوئے ہیں سب سے پہلے سلطان عبدالحمید خان ثانی ترکی معزول ہوئے
ان سلطان کی وہ ہیبت اور شوکت تھی کہ تمام دنیا انکے نام سے کانپتی تھی
اور یورپ میں اس تاجدار نے تہلکہ ڈال رکھا تھا۔ لاکھوں آدمیوں کی جان
اس ایک مشت خاک کے ہاتھ میں تھیں مگر جب خدا نے اپنی قدرت کا تماشا
دکھانا چاہا اور عزت کی درج سلب کرنے اور عزت طلب لوگوں کو عبرت
دلانے کا ارادہ کیا تو اس شوکت کا نے اوپر کی دنیا ادھر کر دی۔ اور سلطان

عبدالحمید خاں تاجور سے ایک معمولی قیدی بنا دئے گئے۔ جو آج تک گمنامی اور بے عزتی کی قید میں چپ چاپ پڑے ہیں۔

دوسرے عزت دار تاج پوش شاہ ایران تھے۔ انکی عزت بھی خاک میں مل گئی۔ اور چند پرجوش نوجوانوں نے انقلاب کر کے بادشاہ کو نکال دیا اور اسکے بیٹے کو جانشین کر کے پارلیمنٹ قائم کر دی۔

تیسری بے عزتی چین کے حکمراں کی ہوئی۔ جو ہزاروں برس سے کروڑوں آدمیوں پر گویا خدائی کر رہا تھا مگر اس عزت کی اجل بھی آئی اور انقلاب نے اسکو گورمیں دفن کر دیا۔

چوتھی عزت زار روس کی تھی جو یورپ و ایشیا کے عظیم الشان حصوں پر نہایت دبدبہ اور خود مختاری سے سلطنت کر رہا تھا اور جسکی عزت کا آفتاب انقلاب کی بے شمار گھٹاؤں سے کبھی بھی چھپا نہ تھا۔ کیونکہ عزت کی موت کا وقت نہ آیا تھا۔ لیکن مارچ ۱۹۱۷ء میں منحوس گھڑی آگئی اور اس نے ذرا سی مہلت بھی علاج کی نہ دی۔ جس سے وہ اپنی عزت کے مرض کا علاج تو کر سکتا۔ مرگ ناگہاں جس کا نام ہے وہ اس شہنشاہ اعظم اور اسکی بیگم کو برداشت کرنی پڑی۔ ایک گھنٹہ پہلے وہ مملکت وسیع روس کا ایسا شہنشاہ تھا جسکے اشارہ چشم پر سر تسلیم ہوتے تھے اور ایما سے ارد پر جانیں آرادہ باقی تھیں۔ جسکی ہاں اور جسکی ناں پر لاکھوں کروڑوں جی سے کے فوری فیصلے

محصور تھے اور جسکی طرف بڑے بڑے بادشاہوں کی آنکھیں لگی رہتی تھیں
مگر ایک گھنٹہ کے بعد وہ ایک قیدی بن گیا۔ اور مجرموں کی طرح اسے
غلاموں کا حکم سننا پڑا۔ اسکی شہنشاہ بیگم نے نہایت بےکسی اور غریبانہ
عاجزی سے یاس وہراس کے یہ جملے کہے۔

"اب میں محض ایک ماں ہوں۔ اور بیمار بچوں کی حفاظت کر رہی ہوں"
یہ اس عورت کے الفاظ ہیں جسکے حکم نے لاکھوں بچوں کو یتیم کرا دیا تھا
جسکی مرضی سے بےشمار عورتیں بیوہ ہو گئیں۔

کس کی مجال تھی جو زار روس اور اسکی بیگم کی خوابگاہ میں دراسا چلا جاتا
مگر آج ان دونوں کو قیدیوں کی طرح قبل ازوقت بیدار کیا جاتا ہے
اور جانوروں کی مثل ہانک کر مقام نظربندی پر پہنچایا جاتا ہے۔
اور یہ غریب کچھ نہیں بول سکتے اور نہیں کہتے ہیں ... کہ ہم تمہارے
ہر حکم کی تعمیل کو تیار ہیں۔

اے انسان عبرت پکڑ اس انجام سے۔ اے آدمی ڈر اپنی گردش سے
غرور نہ کر عزت پر اترا نہ جا کہ ایک دن [illegible] آیا کرتی ہے
اور ایک وقت سب جاہ وجلال [illegible] ہیں۔
[illegible] کے چھلکے [illegible] گور میں ہیں پڑے
کہ جہاں [illegible] اور [illegible] مالک تھے

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم — آج اس جا ہے آشیانۂ بوم
مظہر ہستی کا جو سر ملے تھے — [illegible]
گردش چرخ سے ہلاک ہوئے — استخواں تک [illegible] خاک ہوئے
ذات معبود جاودانی ہے — باقی جو کچھ ہے [illegible] فانی ہے
صبح دم طائران خوش الحان — پڑھتے ہیں کل من علیہا فان

۵۸۹ ٹائٹانک جہاز کی اصل

کئی برس ہوئے یورپ میں ایک جہاز بنا تھا جس کا نام ٹائٹانک تھا۔ اس جہاز میں ایسے آلات اور ایسی چیزیں لگائی گئی تھیں جو اسے ڈوبنے نہیں دے سکتیں۔ اور یورپ کے ہر عاقل شخص کو یقین تھا کہ یہ جہاز کسی طوفان میں غرق نہیں ہو سکتا۔ یہ سب سے بڑا جہاز تھا۔ اس میں دنیا کے عیش کا سب سامان فراہم کیا گیا تھا اسکو اہل عقل کی کاریگری کا سب سے بہتر نمونہ سمجھا جاتا تھا یہی وہ چیز تھی جسکے گھمنڈ نے انسانوں کو دریا کے خطروں اور موت کے اندیشوں سے بے پروا کر دیا تھا۔

حضرت نوحؑ کے طوفان پر جنکو یقین نہ تھا۔ حضرت نوحؑ کی کشتی کی نجات پر جو ایمان نہ لاتے تھے۔ عالم اسباب کی مدد سے موت کا مقابلہ کرنے اور اس پر فتح پانے کا جنکو غرہ تھا وہ سب حیران رہ گئے جب انھوں نے

اخباروں میں یہ پڑھا کہ ٹٹانک جہاز ایک برف کے ٹکڑہ سے ٹکرا کر آناً فاناً
میں ڈوب گیا اور اسکے بڑے بڑے نامور مسافر موت کے گھاٹ اتر گئے
ان میں انگلستان کے مشہور انشاپرداز مسٹر اسٹیڈ ایڈیٹر ریویو آف ریویوز بھی تھے
سمندر میں قدرتی برف کی ایک چٹان تیرتی پھرتی تھی۔ رات کے
وقت جہاز اس سے ٹکرایا۔ مسافر بے خبر پڑے سوتے تھے۔ ان کو جگایا
گیا۔ کہ اٹھو جہاز ڈوبتا ہے اور موت آتی ہے۔ تو انہوں نے جھلا کر جواب
دیا جھوٹے ہو یہ جہاز قیامت تک نہیں ڈوب سکتا۔ اس میں اس قسم کے
آلات لگے ہوئے ہیں جو کمالات سائنس کی بہترین یادگار ہیں اس
جہاز کو کسی قسم کا خطرہ نہیں ہے۔ تم بکو مت۔ جاؤ سونے دو۔
مگر وہ پھر ایسے سوئے کہ اب شاید قیامت کو بیدار ہونگے۔ ٹٹانک چند منٹ
میں غرق آب ہو گیا اور عقل پر گھمنڈ کرنے والے اپنے بستروں پر پڑے
ہوئے دم گھٹ گھٹ کر مر گئے۔
جب موت آگئی تو انہوں نے دیکھا کہ زندگی اور موت خدا کے قبضہ میں تھی
انسان بالکل بے بس تھا۔ اور ہماری بڑی بھول تھی جو ہم نے خدا کو چھوڑا
اور اسباب مادی پر بھروسہ کیا۔
قدرتی برف سمندر کے کھاری پانی میں غوطے کھاتی تھی۔ اور وہ آدمی جو
بجلی کی روشنیوں میں ہوٹلوں کے اندر بیٹھ کر شیشہ کے گلاسوں میں سوڈا

برف ہلا ہلا کر پیا کرتے تھے۔ آج وہ خود سمندر کے گلاس میں برف اور سوڈا واٹر (آب سمندر) میں مل کر اس تنکے کی طرح جھٹکے کھا کھا کر دم توڑ رہے تھے جسکو کبھی کبھی انہوں نے گلاس میں دیکھا تھا اور خان سامان پر خفگی ظاہر کی تھی۔

حسن نظامی

بادشاہوں کا وقت آخر

سلطان محمد تغلق نے ۲۱ محرم ۷۵۲ھ کو حالت نزع میں اشعار ذیل موزوں کئے تھے ؎

بسیار دریں جہاں چمیدیم	بسیار نعیم و ناز دیدیم
اسپانِ بلند بر نشستیم	ترکانِ گراں بہا خریدیم
کردیم بسے نشاط و آخر	چوں قامتِ ماہِ نو خمیدیم

رقعہ شہنشاہ عالمگیر (اورنگ زیب) جو بحالت نزع بنام شاہزادہ اعظم شاہ لکھا گیا تھا۔

سلام علیکم و علی من لدیکم پیری رسید و ضعف قوی شد۔ قوت از اعضا رفت۔ یگانہ آمدم و بیگانہ می روم۔ خبر از خود ندارم۔ کہ کیستم و چہ کارہ ام نفسے کہ بے ریاضت رفت افسوس آں باقی ماند۔ مالگذاری و رعیت

پیروی هیچ از من نیامد۔ عمر عزیز از دست رفت۔ خداوند در خانه دارم
و روشنائی آن در چشم تاریک خود نمی بینم۔ حیات پایدار نیست، دوا از
نفس رفته نشانی پدیدار و از استقبال هم توقع مفقود است، حافظ قشون
گروه حیرم و پوست تنها گذاشت۔ فرزند کام بخش اگر چه به بیجاپور رفت
اما نزدیکی ست و آن عالیجاه از آن هم نزدیک تر۔ عزیز القدر شاه عالم
از همه دورتر فرزند زاده محمد عظیم بحکم الله العظیم نزدیک هندوستان
رسید و لشکریان همه بی دست و پا و سراسیمه همچو من مضطرب که از خدا و
تنهائی گزیده در حالت اضطراب است و چون سیماب سراسیمه فهمید که صاحب
نعمتی داریم هیچ با خود نیاوردیم و ثمرهٔ گناهان همراه می بریم نمیدانم که
در چه عقوبت گرفتار خواهد شد هر چند نظر بر الطاف و رحمت امید قوی
است اما نظر بر اعمال و افعال تفکر می گذارد ع

هر چه باد باد ما کشتی در آب انداختیم

اگر چه از خود رفته را فکری نماند اما چون عالم دل تنگی است همه را بخدا می
سپارم حیات بندگان اگر چه پروردگار خواهد کرد لیکن نظر بر عالم ظاهر بر
فرزندان هم ضرور است که خلق الله و مسلمین ناحق کشته نه شوند۔ فرزند زاده
بهادر را دعای آخرین بگویند وقت رخصت ندیدم۔ اشتیاق باقی ماند
بیگم بظاهر اگر چه ملول است لیکن مالک دلها خدا است۔ کوته اندیشی

موشات جُز ناکامی ثمرہ ندارد۔ الوداع الوداع الوداع۔

ترجمہ

سلامتی ہو اوپر تمہارے اور اُس کے جو تمہارے ساتھ ہو۔ بڑھاپا آیا
اور کمزوری کی زیادتی ہوئی۔ اعضا کی دوت جاتی رہی۔ تنہا ہی آیا تھا
اور تنہا ہی جاتا ہوں۔ مجھے کچھ خبر نہیں کہ میں کون ہوں اور کس کام کا
ہوں جو دم ملا یاد الٰہی گذرا [illegible] باقی [illegible] مالگذاری و رعایا
پروری کچھ مجھ سے نہ ہو سکی اور عمر عزیز مفت برباد ہوئی۔ اللہ تعالیٰ
میرے گھر میں موجود ہے مگر اُس کا نور میری چشم کور (اندھی آنکھ) نہ
دیکھ سکی۔ زندگی ناپائدار ہے۔ دم گذشتہ کا کوئی نشان باقی نہیں نہ
آئندہ کی امید باقی ہے قوت نے گوشت و کھال کو تنہا چھوڑ کر مفارقت
کی۔ میا کام بخش اگرچہ بیجاپور پہنچ گیا مگر قریب ہے اور تم اس سے بھی
زیادہ قریب ہو عزیز القدر شاہ عالم (بہادر شاہ) سب سے زیادہ دور ہے
فرزند زادہ (پوتا) محمد عظیم بحکم اللہ العظیم ہندوستان کے قریب پہنچ گیا۔
کل فوج بے دست و پا پریشان اور میری طرح مضطرب اور سیماب وار (پارہ
کی طرح) بیقرار ہے۔ نہیں سمجھتے کہ خدا میرے ساتھ ہے۔ میں کچھ اپنے
ساتھ نہیں لایا تھا لیکن گناہوں کا بوجھ اپنے سر پر لئے جاتا ہوں۔
نہیں معلوم کہ کس عذاب میں گرفتار ہوں گا اگرچہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و

مہربانی تھی اور اس پر نظر ہے لیکن اپنے اعمال و افعال کی وجہ سے فکر نہیں جاتی۔ جو کچھ بھی ہو ہو (اللہ مالک ہے) میں نے ناؤ دریا میں ڈال دی ہے۔

اگرچہ ایک خود رفتہ کو کسی کا کیا خیال ہو سکتا ہے لیکن چونکہ دنیا عالم ولایتی ہے لہذا تم سب کو اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔ ایسے بندوں کی معاملت اللہ تعالیٰ خود کریگا لیکن بعالم ظاہر فرزندوں پر لازم ہے کہ مخلوق خدا اور مسلمانوں کے کشت و خون کا باعث نہ ہوں۔ فرزند زادہ بیدار کو آخری دعا لہو۔ رخصت کے وقت نہ دیکھنے کا اشتیاق باقی رہا اگرچہ ظاہر پوشیدہ ہے لیکن دل کا حال خدا جانتا ہے۔ عورتوں کو بیماری اور بیکسی کے سوائے ناکامی کے کوئی ثمرہ نہیں رکھتی۔ رخصت رخصت رخصت۔

ترجمہ رقعہ عالمگیر بادشاہ بنام شاہزادہ محمد کام بخش بوقت نزع فرزند جگر بند من جہاں تک میرا اختیار تھا میں نے نصیحت اور وصیت کی لیکن چونکہ خدا کو منظور نہ تھا کسی نے نہ سنا۔ اب کہ میں بیگانہ جانا ہوا تمہاری بے بضاعتی پر رحم آتا ہے۔ لیکن بے سود ہے میں نے جو کچھ عذاب و گناہ کیا اس کا پھل اپنے ساتھ لئے جاتا ہوں عجیب بات ہے کہ میں دنیا میں آیا تو تنہا تھا لیکن جاتا اس قافلے کے

ساتھ ہوں۔ سوائے خدا کے مجھے کچھ نظر نہیں آتا۔ لشکر اور لشکریوں کا
خیال اور بھی موجب ملال اور وبال آخرت ہے۔
مجھے اپنی کچھ خبر نہیں ہے۔ میں نے بہت سے گناہ کئے ہیں نہیں
معلوم کس عذاب میں مبتلا ہوں گا۔ مخلوق کی نگہبانی اگرچہ رب العالمین
خود کرے گا لیکن مسلمانوں اور فرزندوں پر بھی واجب ہے۔
جو کچھ ضروری تھا تمہارے حق میں کہا گیا اس کو دل و جان سے
منظور کرو ایسا نہ ہو کہ مسلمانوں کا کشت و خون ہو اور اس کا وبال
میری گردن پر عائد ہو۔ تمہیں اور تمہارے بیٹوں کو اللہ کے سپرد
کرتا ہوں اور خود رخصت چاہتا ہوں۔ اضطراب کی حالت ہے۔

سعید احمد مارہروی

۴۸۶

شاہی محل میں دم توڑنے والی نور جہاں کو دیکھنا۔ یہ فلاکت زدہ
ایرانی امیر کے گھر میں اسوقت پیدا ہوئی کہ وہ بیابان کا مسافر نان
شبینہ سے محتاج مارا مارا ہندوستان آرہا تھا۔
ہوش سنبھالا تو شاہزادہ جہانگیر ابن اکبر شاہ بادشاہ کی محبوب نظر ہوئی
اسی وجہ سے شیر افگن خاں گورنر بنگالہ سے بیاہ کر کے پایۂ تخت سے
دور بھیجدی گئی۔

اکبر مرا۔ جہانگیر تخت نشین ہوا۔ تو نورجہاں شہنشاہ بیگم بنی۔ ہندمیں سونے چاندی کے سکے اسکے نام پر چھپے اور شہنشاہ نے دو کباب اور ایک پیالہ شراب کے عوض سلطنت اسکے ہاتھ فروخت کر ڈالی۔
وہی نورجہاں ہے جو ایک جیب حاپ کوہستان میں پیدا ہوئی تھی اور ماں نے اسکو جنگل میں اکیلا ڈال کر آگے کو راستہ لیا تھا یہی نورجہاں ہے جو اکبر کے شاہی باغ میں کھڑی تھی جہانگیر کی اسکی نگاہ لڑی تھی بھول پن سے اسی نے کبوتر ہاتھ سے اڑا دیا تھا
یہی وہ عورت ہے جسکی خاطر شیر افگن خاں جہانگیر کے ہاتھوں مارا گیا۔
اسی دم توڑنے والی نے سلطنت ہند کے داعیہ داروں کے دم خم توڑ کے رکھ دئے تھے۔ طوطی کی طرح چہکنے والی۔ بلبل کی مثل بولیاں بولنے والی۔ بزم شاہانہ کی شمع رزم شاہانہ میں شیروں کی مانند آگے بڑھ کر گرجنے والی۔ اسی کی تدبیروں نے بڑے بڑے عالی دماغ حکمرانوں کے جوڑ توڑ کو نیچا دکھایا تھا۔ یہی دریا کے کنارے ایک عظیم الشان لشکر سے تیر کمان ہاتھ میں لیکر لڑی تھی۔ یہی ہے جسکے گلے میں سونے کا طوق اور ہاتھ پاؤں میں طلائی ہتکڑیاں بیڑیاں ڈالی گئی تھیں۔ پھر وہی ہے جس نے تلوار کے منہ سے اپنی جان بچا کر حریفوں کو پاش پاش کر کے رکھ دیا تھا۔

آج اسکی موت آئی ہے

آج اس نے سفر آخرت پر کمر باندھی ہے اب کوئی تدبیر۔ کوئی لطیفہ کوئی شعر۔ کوئی نگاہ ناز کوئی سحر تیر ہیں اسکی جان کو پنجۂ اجل سے بچا نہیں سکتا۔

دو شالہ اوڑھے لیٹی ہے۔ چھت پر نگاہیں ہیں۔ دل میں آہیں ہیں سر کا وارث نور الدین جہانگیر بادشاہ خاک میں جا سویا۔ شاہ جہاں جو ساری عمر نور جہاں کی آنکھوں میں کھٹکا سریر آرائے سلطنت ہے۔ مدتوں کے رنڈاپے کے بعد آج موت اسکی زندگی مانگنے آئی ہے۔

نور جہاں سوچتی ہے۔ میں کیسی بدنصیب تھی اسوقت کہ مصیبت کے ایام میں پیدا ہوئی اور ماں باپ نے صحرا میں اکیلا ڈال دیا۔ اور کیسی خوش قسمت تھی اس وقت کہ میری بدولت ماں کی نوکری ہوئی پھر باپ کو امیری ملی۔ اور کیا زمانہ تھا۔ وہ۔ کہ مجھ پر جوانی نے طلسم کا غازہ ملا تھا دنیا کی ہر شے مست نظر آتی تھی۔ میں چلتی تھی تو پیروں تلے خلقت کے دل مسلے ہوئے۔ روندے ہوئے کچلے ہوئے پاتی تھی نرگس کو دیکھتی تو اسکو شرما کر گردن جھکاتا ہوا خیال کرتی۔ اور مجھ کو گھمنڈ ہوتا کہ اس پھول سے میری چشم بیمار کی دید برداشت نہ ہو سکی گل لالہ پر نگاہ جاتی۔ اسکے داغ دار سینہ کو دیکھتی تو جی الٹرین سے

کہا کہ شاید میری فرشتہ نے اس کا سمنہ واع وار بنایا ہے۔ یا میری طرح کسی اور حسین پر اسکا جی آیا ہے۔

چمن میں سرو شمشاد کے سایہ تلے جاتی تو اپنے قد رعنا کی زیبائش پر آپ ہی آپ اترائی۔ اور کہتی۔ مجھ سے زیادہ نہیں ہیں یا اونچے ہیں یا نیچے ہیں۔

ہوا چلتی۔ پھولوں کی ڈالیاں جھومتیں تو میں کہتی۔ انکو تو ہوا جھوکا ہی ہے۔ مجھ پر کیا بلا آتی ہے کہ چلتے چلتے جھکی پڑتی ہوں اندر کوئی چیز ہے جسکے لستہ سے بے قابو ہوئی جاتی ہوں۔

میں وہی نورجہاں ہوں ریشمی صبا کے دامن کھینچی تختہ چمن پر ہری گھاس کو اسی شوخ ٹھوکروں سے ٹھکراتی۔ سوتے فتنوں کو جگاتی دبی قیامت کو اٹھاتی جا رہی تھی۔ سامنے سے شہزادے ولی عہد کبوتر ہاتھ میں لیئے تشریف لائے۔ آداب کو جھکی شرم نے بھی جھکایا۔ جوش شباب نے نظروں کو نگاہوں سے ملایا۔ وہ دم بخود ہو کر کھڑے ہو گئے۔ میں بے اوسان ہو کر پیچھے ہٹی۔ نہ اُن کا قدم آگے بڑھا اور نہ میرا قدم پیچھے ہٹ سکا۔ آخر وہ بولے۔ اور کہا۔

لڑکی میرے کبوتر لیلے۔ میں اتنے ذرا پھول توڑتا ہوں۔ میں نے بسر و چشم کہا۔ مگر کیونکر کہا۔ دل کا اس وقت کیا عالم تھا آج اس کیفیت کو

کیونکر تصور میں لاؤں۔ اب وہ وقت ہی نہیں رہا۔
ایک کبوتر پھڑک کر اُڑ گیا۔ شہزادے واپس آئے۔ اور بولے۔
ہائیں میرا کبوتر کیا ہوا۔ میں نے عرض کی۔ صاحب عالم۔ اُڑ گیا۔
بولے کیونکر۔ میں نے ہاں شاید میں نے ہی۔ بہت سادگی۔
بہت بھول پن سے دوسرے ہاتھ کا کبوتر اُڑا کر کہا۔ جناب اس طرح۔
شہزادے پھر چپ ہو کر۔ اور کچھ دیکھ دیکھ کر۔ اور ایک ہلکا سا
سانس لیکر۔ جس سے میں نے گرمی۔ خنکی اور سب ہی کچھ محسوس کیا
اُلٹے پھرے۔ اور محل کی طرف بڑھے۔ میں کھڑی رہ گئی۔ میری برابر
ہوا گلاب کی شاخ کا سر ہلاتی تھی۔ بے تاب پتیوں کو فرش خاک پر
گراتی تھی میں نے دل کی ایک نامعلوم حالت سے بے چین ہو کر
برگ گل کو دیکھا۔ مگر شاید کچھ نہ دیکھا۔ میری آنکھوں پر ایک خمار نے
پردہ تان دیا تھا۔ ابھی میں اپنے ہوش کی اس نیرنگی پر غور کرنے
نہ پائی تھی۔ ابھی میرے دل نے اس ہوش ربا منظر کی لذت کو آ پ سے
لب سے دور نہ کیا تھا کہ شہزادے پھر اُلٹے پھر کر آئے۔ اور فرمایا۔
تمہارا نام کیا ہے۔ میں نے قبا کے دامن کو اس طرح مضبوط پکڑ کر
کہا گویا میں ایک بھاری چیز پر سہارا دیتی ہوں۔ میرا نام مہر النسا ہے
امیر غیاث کی بیٹی۔ شہزادے نے پھر ایک مایوس مگر ان کہی نظر مجھ پر

ڈالی۔ اور محل کی جانب چلے گئے۔

بس وہی مہرالنساء ہوں بنگالہ کی ملکہ بنی بیٹھی تھی۔ شوہر بنگالہ کا حاکم زائچہ دیکھ کر بولا بیگم تاج تمہارے سر پر قربان ہوتا نظر آتا ہے خاوند کا یہ کہنا تھا۔ تاج والی بات کانٹے کی طرح دل میں کھٹکی۔ مگر زباں سے پردہ کیا۔ بولی میرا تاج شاہی تمہاری ذات ہے۔ تم سلامت ہو تو ملکہ ہند ہوں۔

ہاں گیری تیغ نے شیر افگن جاں شوہر کا کام تمام کیا۔ میں قیدی بنی حرم شاہی میں آئی۔ شاہ نے پیام نکاح بھجوایا۔ میرے دل نے غم بھلایا مگر زباں پر یہی آیا۔ کہ لونڈی غمگین ہے۔ اس سے یہ چھیڑ خلاف آئین ہے۔

وقت بدلا۔ بستر شاہ تک پہنچی۔ محل کی ملکہ بنی۔ فرمانوں اور سکوں پر نورجہاں درج ہوا۔ تلواریں قدموں پر ٹیکنے لگیں سرکش امرا گردنیں جھکا کر سلام کرنے لگے اور میرے سوا اسے بڑے ہندوستان میں کوئی عزت والا۔ عیش و راحت والا۔ اقبال و قسمت والا نہ رہا۔

شوہر تاجدار۔ یا شوہر تاج تار کی حالت آخری دیکھی تو اپنی اولاد کی حکمرانی کا خیال سامنے آیا۔ فکر و تدبیر کو آگے بڑھایا۔ کانٹے توڑے۔ ٹیلے اکھیڑے۔ میدان راہ کئے مگر قسمت پڑی سوتی تھا۔ شاہ جہاں

بڑھ گیا میرے منصوبے کو یہ بادشاہ کے مرتے ہی رانڈ قیدی بنی
گو لائق شاہجہاں نے ہر اس کا سامان مہیا کر دیا۔

اب میں وہی نورجہاں ہوں کہ موت کو بیٹھی ہوں اپنی بھول بھلیاں
کہانی دل سے کہتی ہوں اور مرتی ہوں

آہ میری اجل آئی ہے کہ کا ملکہ دائی اور شہنشاہی کے ایام میں
خیال بھی نہ آتا تھا۔

مر جاؤں گی۔ غریبوں اور محتاجوں کی طرح گور میں جاؤں گی وہاں نہ
کافوری شمع ہو گی۔ نہ پھول کی بہار۔ نہ بلبل ہو گا۔ نہ پروانہ۔

بر مزار ما غریباں نے چراغے نے گلے
نے پر پروانہ سوزد نے صدائے بلبلے

یہ سوچتے سوچتے کروٹ لی۔ شال کو سمیٹا چپ چاپ لونڈیوں کو دیکھا
جو پلنگڑی کے آس پاس سر جھکائے بیٹھی ہیں۔ اور بولی۔ شہناز
کچھ بول۔ نیک قدم زبان کھول۔ دردانہ تو ہی کچھ کہہ۔ ارے
میں مرتی ہوں دیکھو میرا وقت آخر آپہنچا۔ کیا موت سب کو آیا کرتی ہے
کیا مرنا ہر جاندار کو لازم ہے۔ کل نفس ذائقۃ الموت میں کیا میرا نفس
بھی مراد تھا۔

مجھے اٹھاؤ۔ تکیہ سے لگاؤ۔ شربت لاؤ۔ دو گھونٹ دو۔ جان لبوں پر

آئی ہے۔ اس محل میں کیسی کیسی خوشیاں ہیں یہ دیکھیں۔ یہ اجل
ان سب کو ختم کرنے آئی ہے۔ باہر جاؤ کیا سب باغ اُجڑ گئے۔
کیا سب نہریں سوکھ گئیں۔ کیا تمام بلبل خاموش ہوگئے۔ شمع کو دیکھو
کیا وہ بھی پگھل چکی۔ پروانہ پر نظر اُٹھاؤ اس میں کچھ دم ہے یا وہ بھی جل بسا۔
اُف۔ اس زندگی کی داستان کیسی اَدھوری رہ گئی۔ میں نے تو ابھی کچھ
بھی نہ سنا تھا۔ داستان گو کیوں خاموش ہوگیا۔

مجھے لٹاؤ پنکھا جھلو پسینہ پونچھو۔ ذرا سہارا دو میں ایک بڑی منزل
طے کرنے چلی ہوں۔ بتاؤ کون کون میرے ساتھ چلے گا۔ قبر کی تنہائی میں
کون میرا جی بہلانے ہمراہ جائیگا۔ کوئی نہیں بولتا۔ کوئی نہیں کہتا۔
بی بی ہم چلینگے۔ ملکہ عالم ہم حاضر ہیں۔ ارے کیا تم سب بے وفا ہوگئے
کیا تم نے ایکا کرلیا مجھکو اکیلا جانے دینے پر راضی ہوگئے۔

لا الہ الا اللہ۔ الملک للہ۔ الحیات للہ۔ موت بہت جلدی آگئی۔
میں نے تو ابھی دنیا میں کچھ بھی نہ دیکھا۔ اسکا نقارہ ایسی جلدی بج گیا
کفن منگاؤ۔ میں اسکو دیکھوں ایسا نہو برا کپڑا ہو۔ ایسا نہو میرے بدن کا
ٹھیک نہ آئے کیا تم کافور میں اسکو بساؤ گے؟ کیا مجھکو معمولی تختے پر لٹاؤ گے
اور کھینچ کھینچکر نہلاؤ گے؟

اُف! میرا دم گھٹتا ہے میرا سانس رکتا ہے کیا موت اسی کا نام ہے؟

مجھے چکر آتا ہے میرا سر پھرا جاتا ہے۔ میرے دل پر کسی چیز سے چوٹ لگ رہی ہے اور وہ ان دھماکوں کی تاب نہیں لا سکتا۔ میرے ہاتھ پاؤں کی رگیں دماغ کی طرف سمٹ رہی ہیں۔ میرے سینہ سے کوئی چیز سانس کے ساتھ حلق میں آکر ٹکراتی ہے بدن میں سن سن کی آواز آتی ہے۔ مجھے جمائی لینے دو۔ مجھے انگڑائی آتی ہے اس جمائی نے اس انگڑائی نے میرا جسم مردہ کر دیا۔ میرا دم گھٹ رہا ہے۔ اور میدہ کا سا غلبہ آنکھوں پر چلا آتا ہے۔ ذرا لینا۔ ذرا لینا۔ میں چلی میں۔ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ علی ولی اللہ۔ وصی رسول اللہ۔

یہ کہتے کہتے ہندوستان کی مشہور تاریخی کتاب مشہور استعار کی کتاب مشہور فلسفہ حیات کی کتاب مشہور تمدن و معاشرت کی کتاب اور حسن و عشق کی پتلی۔ مگر اُس کے جذبات کا بولتا ہوا گلدستہ غم دہر۔ اور سرور کائنات کی بے نظیر بہار دکھانے والی ملکہ۔ مرگئی۔ اور کہہ گئی کہ مرنا سب کو ہے اور مرنا ہی وہ چیز ہے جس سے راحت ابدیا زحمت دوامی میسر آتی ہے۔

حسن نظامی

موت

زندگی ہر شخص کو نہایت عزیز ہوتی ہے۔ دنیا میں کون ایسا بشر ہے جو اسکے وجود کی خیر نہیں مناتا۔ بوڑھا ہو یا جوان کمسن ہو یا بچہ۔ ہر شخص

طویل عمر کا طالب ہے اور دنیا کی لذتوں کا مزہ چکھنا اور اسکی آرائشوں میں پھنسا رہنا اہل دنیا کا ایک خاص مذاق ہے۔ باری تعالی نے گلشن عالم میں ایسی ایسی مختلف النوع چیزیں خلق فرمائی ہیں جنکو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اور اسکی صناعی و حکمت کی بے ساختہ داد دینی پڑتی ہے منجملہ ان تمام چیزوں کے ایک ایسی خوفناک چیز بھی جاندار کے لئے پیدا کی ہو جس سے ہر متنفس پناہ مانگتا ہے۔ اور اس کا نام سنتے ہی آبدیدہ اور رنجیدہ ہو جاتا ہو۔ کانپنے لگتا ہو۔ لرزنے لگتا ہو۔ وہ کیا ہو؟ موت جو زندگی کی لذتوں اور مسرتوں کو خاک میں ملانے والی ہے اس سے بڑھ کر خطرناک و دل آزار دنیا میں کوئی چیز نہیں ہو۔ یہ بہادر سے بہادر اور دلیر سے دلیر شخص کو آن کی آن میں پچھاڑ دیتی ہو۔ کسی کا اس سے زور نہیں چلتا اور آج تک کوئی اس سے جیت نہ سکا۔

اے موت تجھ سے ایک زمانہ نالاں ہے اور دنیا میں کون ایسا ہو جو تیرے تیر کا نشانہ نہیں بنا اور نہیں بنے گا۔ روز ازل سے تیرا طریقہ تیرا ڈھنگ تیرے تیور۔ تیرا مزاج قاتلوں کی مانند ہے۔ تو جہاں کی رونق کو برباد کر دیتی ہے۔ اے موت تیرا سکہ بحر و بر پر بیٹھا ہوا ہے۔ سارا جہان تیرا لوہا مانے ہوئے ہے۔ تیری کوئی برابری نہیں کر سکتا۔ اے موت تیری تیغ فنا سے کسی کو اماں نہیں طفل ہو۔ پیر ہو۔ جوان ہو کسی میں تو

امتیاز نہیں کرتی تیرے دل میں رحم نہیں ہمدردی نہیں مروت
نہیں۔ تو نے غنچہ ہو یا گل کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ ایک بار اگر کسی نونہال پر
تیری قہر و غضب کی بجلی گری تو پھر اُسکی ہستی خاک سیاہ ہو جاتی ہے دنیا
جو سوگواری کا لباس پہنے رہتی ہے یہ تیری توجہ کا نتیجہ ہے قصبہ یا شہر
جو ویران نظر آتا ہے وہ تیرے ہی التفات کا ثمرہ ہے۔ کیسی کیسی ہستیوں
کو تو نے خاک میں ملا دیا۔ اپنے پنجۂ الم میں گرفتار کیا۔ آج ہم جن کے
دردناک افسانے کان لگا کر سنتے ہیں عبرت و بصیرت کے سبق حاصل
کرتے ہیں وہ تیرے جور و ستم سے نالاں سدھارے ہیں اور اپنے اپنے
دلوں میں کیسے کیسے حسرت و ارمان لے گئے ہیں تیری سحور یا اور
مخرب اخلاق باتیں قابل بیان نہیں۔ تو غریب الوطنی کی حالت میں بھی
رحم نہیں کھاتی کوئی بیچارہ بھائی بہن عزیز و اقارب سے دور ہے وہ
منتیں اور التجائیں کر رہا ہے کہ چند دنوں کی تو مہلت دے کہ آخری دیدار
کر لوں مگر تو ایسی بے رحم و سنگدل ہے کہ کسی کی کوئی بات سماعت
ہی نہیں کرتی۔ تو اُنکے بھی دباؤ میں نہ آئی اور اُنکو بھی تخت شاہی سے
اُتار کر فنا کا لبریز جام پلا دیا جن کا راج پاٹ مشرق سے مغرب تک تھا
اور جن کو خورشید خاور بھی خراج دینا اپنا فرض سمجھتا تھا اب نہ رستم کا نشان
ہے نہ اسفندیار کا پتہ۔ نہ افلاطون و بقراط ہیں نہ نیوٹن اور بیکن۔

نہ شکسپئیر کا وجود ہے نہ اڈیسن کا۔ نہ وہ عظیم الشان سلطنتیں باقی ہیں۔ نہ اُن حکماء و علماء سفر کا قابل رشک جماؤ ہے۔ غرضکہ تو نے کسی کو نہ چھوڑا اور اُن کی کسی مدبیر کو چلنے دیا۔

پیر فلک کی نظروں میں نہ دلچسپ نظارہ ہے۔ اُسکو وہ ابتدا آفرینش عالم سے دیکھ رہا ہے اُس نے یاس و نامرادی اور ارمان و حسرت کی خطرناک لڑائیاں دیکھی ہیں۔ اس نے موت و حیات کی باہمی کشمکش کو دیکھا ہے۔ اُس نے روح و جسم کی مفارقت کے آخری اضطراب کا تماشا دیکھا ہے اس نے آخری دم کی تکلیف وہ غنودگی ایڑیوں کی ٹپک اضطرار و اضطراب غرضکہ انسان و حیوان کے آخری سفر کے تمام جگر خراش تماشے دیکھے ہیں۔ جب یہ تمام واقعات اُسکی خونخوار آنکھیں دیکھ چکی ہیں تو یقیناً وہ سنگدل ہوگا اور سنگدل کسی پر کیوں رحم کھانے لگا۔

اے موت۔ بہت سے مصیبت زدوں کو دیکھا ہے کہ وہ تیری دید کی تمنا رکھتے ہیں۔ حرماں نصیبوں اور فراق کے ماروں نے تو تجھ پر اپنی پیاری جانیں قربان کردی ہیں پروانوں کو دیکھو کہ وہ اپنی جانوں کو بلا خوف و خطر تیرے حوالے کردیتے ہیں یہ باتیں شاذ طور پر پائی جاتی ہیں مگر اکثر دیکھا گیا کہ تجھ سے ہر شخص بھاگتا ہے اور تیرا نام آتے ہی آدمی کی روح قبل از وقت پرواز کر جاتی ہے۔

انسان کی عمر کا جس قدر حصہ ترقی کرتا جاتا ہو آرزوؤں - امیدوں اور مسرتوں میں کمی ہونی جاتی ہو - لیکن باوجود اُن نامرادیوں کے اُس کے دل میں جینے کی ہوس روز افزوں ترقی کرتی جاتی ہو - اور اُس کی یہ دلی آرزو ہوتی ہو کہ جتنی عمر دراز ہو اتنی ہی مسرت کا باعث ہو - تاکہ کچھ دن اور باغ زندگانی کی خوشگوار ہوائیں کھائیں -

ضعیفی کی زندگی نہایت تکلیف دہ ہوتی ہے - اعصائے جسمانی کمزور ہوش و حواس میں نمایاں فرق - اُٹھنے بیٹھنے میں مصیبت - ذرا ورا سے کاموں کے لئے دوسروں کے محتاج اور ہر ایک خواہش میں دوسروں کے دست نگر ہیں - ان ہی وجوہات سے سکندر نے دوامی زندگی کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا - آب حیات کی خواہش ترک کر دی اور صاف کہہ دیا کہ ایسی زندگی سے موت بہتر ہے - سکندر کے سوا دوسرے سے یہ امر غیر ممکن تھا - اس لئے کہ وہ عالم شباب کے جوش میں تھا - کسی بوڑھے سے پوچھو جو ضعیفی کی آئے دن کی سختیوں اور تلخیوں کا مزہ چکھ رہا ہو - وہ کبھی اپنی زبان سے نہ کہے گا کہ مجکو موت آ جائے - کیونکہ باوجود ان تمام مصائب کے وہ زندگی کو نعمت سمجھتا ہے اور اسکی افزونی کی آرزو رکھتا ہے -

مرنے کے بعد بھی انسان اپنا نام زندہ رکھنا چاہتا ہو - انسانی ہوس کا یہ تقاضا ہے کہ بقائے نام کے لئے قبر پر کتبہ رہے - لوگ آئیں تو

ہمارے نام ہی سے ہم کو یاد کریں۔ ذکرگذشتہ کو دل میں تازہ کریں
باوجود دنیا سے رخصت ہو جانیکے انسانی طبع کی خام خیالی اور خود داری پر
ہمیں تعجب ہوتا ہے کہ وہ سب لوگ جن کو زندگی میں بڑی بڑی سلطنتیں
تسکین نہ دے سکیں۔ زیر زمین دبے پڑے ہوئے ہیں۔ خاک میں
وہ کاخ وایوان کہاں! ڈیڑہ دو گز کی زمین پر عوام کی طرح لیٹے ہوئے
ہیں مگر بظاہر اپنے نام کو جو ایک مدت تک کام عالم کو محو خیال اور گرم تحسین
رکھنے کا دم بھرا تھا۔ چند سالوں کے لئے فراموشی سے بچانے اور کسی
طرح سے ایک نظر دیکھ لینے کے لئے کتنے طریقے کیسی کیسی شکلیں اور
کیا کیا صنعتیں اختیار کی گئی ہیں۔

یہ قاعدہ ہے کہ دوست واحباب چیز بست۔ پالے ہوئے جانور۔
بنائے ہوئے مکان۔ لگائے ہوئے درخت اور اسی قسم کی ہزارہا چیزیں
جن کا ہر وقت ساتھ رہتا ہے ہم کو ان سے اسی قدر محبت ہو جاتی ہے
جس قدر کہ ہمارا اور ان کا ساتھ رہے۔ اور ہماری نظر کے سامنے رہیں
ایک دوست جس سے الفت و محبت کے پینگ بڑھ جاتے ہیں۔ اور کسی
قسم کی طرح ان میں مغائرت نہیں رہتی ہے اسکی صاف وجہ یہ ہے کہ ہمارا
ان کا ہمیشہ ساتھ رہتا ہے ہم وہ ہر وقت اٹھتے بیٹھتے اور ہم صحبت
رہتے ہیں۔ ایک مکان میں جو شخص مدت دراز تک اپنی زندگی بسر کرتا ہے

تو اسکو در و دیوار سے الفت ہو جاتی ہے۔ جب وہ اُسکو چھوڑنا چاہتا
ہے تو دل میں اُسکے ایک قسم کا درد ہوتا ہے۔ اسکی جدائی شاق ہوتی ہے
اسکا فراق تکلیف دہ نظر آتا ہے۔ اُسکا چھوڑنا بہت بُرا معلوم ہوتا ہے۔ کسی
مکان کو جو شکستہ حالت میں ہو اور اُسکو بدو شعور سے دیکھتے چلے آئے
ہوں۔ اگر اُسکو گرتا دیکھیں گے تو ہم کو رنج ہوگا افسوس ہوگا۔ ایک خاص
کیفیت دل پر طاری ہو جائیگی ان چیزوں سے یہ بات پایۂ ثبوت کو
پہنچتی ہے کہ یہ بات ہمارے خمیر میں موجود ہے کہ جس چیز کو ایک عرصہ تک
دیکھتے رہتے ہیں۔ اُس سے دلی اُنس ہو جاتا ہے۔ یہی چیز ہے جو ہم کو
تری عمر کی خواہش میں غلطاں و پیچاں رکھتی ہے۔ کیونکہ زندگی کا بڑا
حصہ دنیا میں بسر ہوا۔ اس لیے طبیعت گوارا نہیں کرتی کہ ہم اس سے
الگ رہیں۔ ان عارضی و نمایشی چیزوں کا ساتھ چھوڑ دیں اور وہاں جا کر بسیں
جہاں کے حالات و واقعات سے ناواقف۔ طرز معاشرت سے بے بہرہ
رسوم و رواج سے ناآشنا ہیں۔

دنیا کی ہر شے میں گو رفتار زمانہ کے ساتھ انہدام کے آثار نمایاں ہیں
مگر اس شکستگی پر بھی مو تراور بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اسی سبب سے ہم دنیا میں
زندہ رہنے کے آرزومند ہیں۔ اور اے موت تجھ سے پناہ مانگتے ہیں
جو لوگ دنیا و مافیہا کو فانی سمجھتے ہیں جو حقیقت میں عالی ہی ہے

وہ دنیا سے اسی ولبستگی نہیں پیدا کرتے کہ موت کا خیال انہیں سوہان روح ہو۔ وہ دنیا کی خواہشوں میں اس قدر محو نہیں ہو جاتے کہ موت سے غافل ہو جائیں نہ اہل اللہ ہیں۔ ابرار و احرار ہیں کہ موت سے ڈرتے نہیں اور خوب جانتے ہیں کہ آنے کے وقت نہ آسکے ہی رہے گی۔ موت کا وقت اسکے اطمینان کا وقت ہوتا ہے۔ وہ راضی برضا رہتے اور جان مستعار سو نپتی جان آفریں کے حوالے یہ کہتے ہوئے کر دیتے ہیں کہ

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

موت کا ڈر ان ہی کو زیادہ ہوتا ہے جو لوگ دنیا سے محبت رکھتے ہیں اور لہو و لعب میں اپنی عمر عزیز کو گنوا دیتے ہیں۔ موت کا خیال کرکے نیکیوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتے جب موت کا وقت آجاتا ہے تو سراسیمہ ہو جاتے ہیں کہ افسوس ہم نے توشہ آخرت کی کچھ فکر نہ کی منزل دشوار گذار ہے کیونکر طے ہو گی۔ برائیاں سامنے آکر انہیں موت کا خوف دلاتی ہیں کہ دیکھو تم اپنے ساتھ ہم کو لئے جاتے ہو دنیا میں رہنے سہنے کھانے پینے پہننے۔ آرام و آسائش پانے کا تو ہر طرح خیال رکھا کوشش کی۔ مگر اب جہاں جاکے رہو گے وہاں کے آرام کا کوئی خیال نہ کیا۔ اب تمہارے ساتھ نہ تمہاری بیوی ہو گی نہ بچہ نہ کوئی عزیز نہ دوست۔ اکیلے قبر کے تنگ و تاریک حجرے میں پڑے رہو گے۔ جو لوگ دم بھر کو

تم سے الگ ہونا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ اب تمہیں کبھی پوچھنے (فاتحہ خوانی) کے لئے بھی نہ آئیں گے۔ افسوس ہے کہ زندگی یوں برباد ہوگئی اور مرنے کے بعد کی کچھ فکر نہ ہو سکی دیکھو کیسے کیسے شاہان اولوالعزم فنا ہوگئے۔ نہ وہ رہے نہ ان کے ایوان و محل۔ نہ اکثر کے مزار۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔

ہوش بلگرامی

از رسالہ ترجمان لاہور ایڈیٹر رسالہ ذخیرہ حیدرآباد دکن

غالب مرحوم

۲۸۶

جس نے اردوئے معلےٰ یعنے رقعات غالب کو پڑھا ہے وہ شہادت دے سکتا ہے کہ اُسکے خطوط کی اوسط نکالی جائے تو ساٹھ فیصدی خطوں میں موت کا ذکر ہے۔ کہیں وہ موت کی آرزو کرتے ہیں۔ کہیں انہوں نے موت پر سرورِ ابد کا انحصار رکھا ہے۔ کہیں اپنے مرنے کی پیشگی تاریخ کہی ہے غرض موت کی یاد ہر وقت اسکے قلم کی زبان پر رہتی تھی۔

عذر ۱۸۵۷ء میں انکی آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے انقلابات ہوئے اور شرفا و امرا پھانسیوں پر لٹکے اسکے اثر سے انکے ادبی جذبات ہر وقت مرگ آلود رہتے تھے۔ رقعات غالب پڑھ کر بے اختیار رونا آتا ہے۔ کیونکہ غالب نے اپنی سادہ اور بے مثل بولتی ہوئی تحریریں لاجواب

کمال سے ان حالتوں کا نقشہ کھینچ کر دکھا دیا ہے۔ میں اس کتاب کے ناظرین سے عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ رقعات غالب اکثر اوقات پڑھا کریں۔ اگر انکے دل کو انقلاب ایام کی بہار دیکھنے کا شوق ہو۔ اسوقت انکو معلوم ہوگا کہ ہندوستان کا یہ سب سے بڑا فلسفی شاعر کس قدر موت کو یاد رکھتا تھا۔ اور نجات آخرت کی اس کو کس قدر فکر تھی۔ اکثر خطوط میں دستخط کرنے وقت یہی لکھا ہے۔ نجات کا طالب غالب۔

وقت وفات کے حالات میں نے جناب نواب سعد الدین احمد خاں صاحب طالب خلف جناب نواب ضیاء الدین احمد خاں صاحب نیر دہلوی سے دریافت کئے تھے انہوں نے جو تحریری جواب بھیجا ہے وہ بجنسہ نقل کیا جاتا ہے۔ دیکھو جس نے موت کو یاد رکھا وہ باوجود شرب مدام خدا کی رحمت سے بخشا گیا۔ حسن نظامی

جناب طالب دہلوی کا مکتوب

نزع غالب کی بابت

دہلی۔ گلی قاسم جان ۱۵۔ اپریل ۱۹۱۷ء

دستگیر عزیز ۔۔۔ ۱

حضرت۔ السلام علیکم جناب غالب مرحوم کی نسبت جو کچھ وقت نزع

سننا۔ اور دیکھا تھا۔ لکھکر ملفوف خط ہذا ہے۔ اور کچھ مجکو علم نہیں۔ والسلام
ہاں ایک نقل مولوی اموں جان صاحب مرحوم ولی تخلص جو ارشد تلامذہ
غالب مرحوم سے تھے کی زبانی لکھتا ہوں۔ وہ مجھہ سے فرماتے تھے
کہ بعد انتقال مرزا صاحب مرحوم میں پانی پت میں جناب مولانا
غوث علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اپنے پیر و مرشد کی خدمت میں گیا
ایک روز میرے جی میں آیا کہ میرزا صاحب کے انجام کی بابت حضرت سے
دریافت کروں سو قبل اسکے کہ میں کچھ پوچھوں حضرت صاحب نے
بوقت ملاقات میرے حدیثہ باطن کو دریافت فرما کر خود بخود حاضرین کی
طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ بھئی غالب مرحوم بھی اپنے فن میں یکتائے
روزگار تھا اور غالبًا اللہ جل شانہ نے اُسے بخش دیا کیونکہ وہ دم بازپسیں
بارگاہ جناب الٰہی میں عرض کر رہا تھا کہ اے پروردگار عالم جس کام پر تو نے
مجھے مامور کیا تھا وہ جس طرح اور جیسا مجھ سے ہو سکا میں نے انجام کو پہنچایا
اب میری مغفرت تیرے ہاتھ ہے۔ سو وہ ارحم الراحمین ہے سب کی سنتا ہے
اور دعا قبول کرتا ہے۔ احقر العباد طالب

یادداشت وقت نزع

غالب مرحوم نے انتقال سے چند روز پہلے مولوی بہاء الدین صاحب
مرحوم کے سامنے یاداشت بہ زبر کی تھی مولوی صاحب مرحوم موصوف

حکیم محمود خاں صاحب مرحوم کے خاندان کے استاد تھے حکیم غلام رضا خاں صاحب مرحوم نے مولوی صاحب کو اپنے ہمراہ لاکر توبہ کرائی تھی میں مدات خود اس وقت موجود نہ تھا مگر یہ واقعہ میں نے ان کے قریب الوقوع ہی سنا تھا حضرت غالب مرحوم پر انتقال سے دو تین روز پہلے غش طاری ہو گئے تھے اس حالت میں اکثر میں انکی خدمت میں حاضر رہا کبھی مگس رانی کرتا کبھی اور کچھ جو تیمارداری کے متعلق ہوتا اسی غشی کی حالت میں یا جب دوا وغذا کے لئے حضرت کو بیدار و ہوشیار کیا جاتا تھا تو اکثر صرف (اللہ) زبان مبارک سے نکلتا تھا اور کبھی کبھی (اللہ موجود) اسکے سوا میں نے کوئی اور لفظ انکی زبان سے نہیں سنا۔

نامی مسلمانوں کے اقوال

۱۴۶

موت کے متعلق

یہ کتاب کم ٹو موت میں نے اس نیت سے لکھی ہے کہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو آخرت کی زندگی یاد دلاؤں۔ یا موجودہ زندگانی کا انجام سامنے لاؤں تاکہ وہ عقبیٰ اور موت سے غافل نہ رہیں۔ کیونکہ بعض اثرات مغربی نے انکو شوق زیست کا اس قدر دیوانہ و متوالہ سا دیا ہے کہ آخرت کا خیال بھی کبھی انکے ذہن میں نہیں آتا۔

ذیل میں آخر زمانہ کے ان نامور مسلمانوں کے اقوال فنائیہ درج کئے
جاتے ہیں جو نیچری مشہور ہیں۔ اور جنکو نئی روشنی والوں کا پیشوا سمجھا
جاتا ہے۔ اور اس لئے عام طور سے انکی دنیا پسندی اور آخرت فراموشی
کی شہرت ہے لیکن جب انکی باتوں کی کیفیت پڑھی جائیگی تو ہر نئی
روشنی والے کو عبرت آئیگی کہ جنکی تقلید اور پیروی میں اس نے
وقتِ اجل کو دل سے دور کیا تھا وہ سب کے سب خدا اور موت کو ہر وقت
یاد رکھنے والے تھے۔ اور ہم لوگوں نے خواہ مخواہ انکو منکر آخرت تصور
کرکے اپنے الحاد و انکار کا بار اُنکے ذمہ لگا یا ہے۔

شمس العلما ڈپٹی نذیر احمد مرحوم

کا نام نامی کون مسلمان نہیں جانتا۔ ہر پڑھے لکھے عورت مرد کی
زبان پر انکا نام ہے اور ہر تعلیم یافتہ دل میں انکا احترام ہے۔
انکی قومی۔ علمی۔ دینی خدمات نے ذکور و اناث دونوں کو دماغی۔ ذہنی
فائدے پہنچائے ہیں۔ مگر بعض خود غرض لوگوں نے لگاتار کوششوں سے
یہ مشہور کر دیا تھا کہ ڈپٹی صاحب ملحد۔ منکر آخرت۔ اور عقائد اسلامی کے
برہم کنندہ ہیں۔ اور اس شہرت نے ابتک لوگوں کے دلوں میں
یہ بات جما رکھی ہے۔ لہذا میں ڈپٹی صاحب کا ذکر چند الفاظ میں سناتا ہوں

اس سے معلوم ہو جائیگا کہ جو لوگ عداوت سے انکو منکر آخرت کہتے تھے وہ بھی جھوٹے۔ اور جن نوجوانوں نے ڈپٹی صاحب کی تقلید کی آڑ لیکر حیات عقبی سے انکار کیا ہو وہ بھی احمق و دیوانے۔

ڈپٹی صاحب کی رحلت سے چند ماہ پہلے کا ذکر ہے۔ راقم الحروف اُنکی خدمت میں اکثر جایا کرتا تھا۔ اور گھنٹوں بیٹھتا تھا۔ اس زمانہ میں انکی زبان پر آیات قرآنی کے سوا اور کچھ نہ تھا اور آیات بھی فنا۔ بے ثباتی کائنات۔ اور موت عاقبت کی فسنت پڑھتے تھے۔ اور زار و قطار روتے رہتے۔ ایکدن میں نے کہا۔ جناب اس قدر مضطرب ہونا اور ہر وقت موت کے خیال سے دل کو بے قرار رکھنا اصول جدید کی بموجب صحت جسمانی کو مضر ہے۔ فرمایا صحت جسمانی کس مردود کو درکار ہے۔ صحت روحانی اور صحت ایمانی خدا دے۔ اور وہ یاد آخرت کے بغیر ہوتی نہیں۔

ان کا تکیہ بہت میلا تھا۔ میں نے ازراہ بے تکلفی و شوخی عرض کیا۔ میرے ایک دوست ہیں خدا نے انکو دولت دنیا سے مالا مال کیا ہے مگر وہ اپنی جان کو آرام نہیں پہنچاتے اور میلے کچیلے بستر میں آرام کرتے ہیں۔ ڈپٹی صاحب اس اشارہ کو سمجھ گئے۔ پیرایہ ہنسی کا تھا مگر وہ رونے لگے۔ اور فرمایا۔ تمہارے دوست کو اگر اُجلے میلے بستر کی پرواہ نہیں ہے تو کچھ حرج نہیں۔ انکی قوم کا بڑا حصہ میلے بچھونوں میں مفلسی کے سبب آرام کرتا ہے۔ خیال آخرت کے بستر کا کرنا چاہئے۔ دیکھئے

وہ کیسا ملتا ہے۔ لحد کے خاکی فرش پر سونا ہوگا یا خدا اپنے فضل سے کوئی اچھا بچھونا دیگا۔ یہ کہکر وہ اس قدر روئے کہ میں شرمندہ اور بےخود ہو گیا۔ کہ ناحق میں نے ایسی بات کہی اور ان کا جی دکھایا۔

مسٹر عبدالرحمن بی اے وکیل دہلی ایام خردسالی میں ان سے کچھ پڑھا کرتے تھے اور خلقت نے مشہور کیا تھا کہ ڈپٹی صاحب ان سے تعلق عشق رکھتے ہیں۔ ایک دن میں گیا تو مسٹر عبدالرحمن پڑھ کر جا رہے تھے۔ میں نے دیکھا ڈپٹی صاحب نے ایک خاص انداز محبت سے انکو رخصت کیا۔ وہ چلے گئے تو میں نے کہا۔ عبدالرحمن بہت ہونہار معلوم ہوتے ہیں۔ فرمایا۔ یہ بھی تو کہو کہ نذیر احمد جان ہار نظر آتا ہے کیونکہ یہ دنیا جب ابتدا دکھاتی ہے تو انتہا بھی یاد دلاتی ہے میں بولا۔ ہر ہونہار جان ہار ہے۔ اس کا ذکر بیکار ہے۔ کہا ہونہار وہی ہے جسکو جان ہاری یاد رہتی ہو۔

ایک روز تزکیۂ نفس اور صفائی باطن پر گفتگو ہونے لگی۔ بولے ہم باطنی احوال کی صفائی میں ایسے لگے کہ سلطنت و دولت ظاہر پر جھاڑو پھر گئی میں نے عرض کیا۔ نتیجہ منطق یہ نکلے گا کہ دولت و ثروت ہم کو ملیگی تو ہمکو باطن پر جھاڑو پھر جائیگی۔ سنجیدہ تبسم سے جواب دیا۔ رونا تو اسکا ہے کہ نہ خدا ملا نہ صنم کا وصال۔ اب تو دونوں حالتوں میں زوال ہے۔

آخر زمانہ میں انھوں نے چند اشغال سلسلہ چشتیہ نظامیہ کے مجھ سے دریافت کیے

میں نے بتائے تو اس طرح جرح و تحقیق کی گویا انہیں پہلے سے معلوم تھے
فرماتے تھے میں نے عاقبت کے خیال کو کبھی جی سے دور نہیں کیا۔ یہ نہ
سمجھنا اب بڑھاپے میں موت کو یاد کرتا ہوں۔
ترجمہ قرآن شریف کا تذکرہ تھا۔ کہنے لگے۔ خدا نے قرآن میں فرمایا ہے هَلْ اَدُلُّكُمْ
عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ کیا میں تم کو ایسی تجارت بتاؤں جو تم کو
آخرت کے سخت عذاب سے بچالے۔ میں نے ہدایت ربانی کی موجب فی آن کا اردو ترجمہ کیا
تاکہ آخرت کی تجارت سے نفع حاصل ہو۔ مگر اب لوگ دنیاوی تجارت کے لئے ترجمے کرتے
ہیں اور میرے ترجمہ کو اس لئے برا کہتے ہیں کہ وہ انکی تجارت کے سد راہ ہے
میں نے کہا حسد بھی دنیا کا عذاب الیم ہے۔ آپکو آخرت کے عذاب سے ترجمہ کی برکت کے
سبب سے نجات ملیگی اور دنیادار تاجر دنیاوی حسد کے عذاب الیم میں مبتلا ہو گئے
اسکا خیال ہی نہ کیجے۔ بولے مسلمان کو دوسرے مسلمان کی آخرت کا بھی خیال رکھنا
چاہیئے۔ آخر میں مسلمان ہوں کیونکر اس کا خیال نہ آئے۔
مار رہا یہ ہوا ہے میں گیا ہوں۔ اور ڈپٹی صاحب نے میرے ہاتھ پکڑ کر اور
رو رو کر فرمایا ہے۔ دعا کرو دعا کرو کہ موت کی سر آسان ہو اور اعمال کی پرسش میں بھی
خدا کامیابی دے۔ ڈپٹی صاحب کے صاحبزادہ جناب مولوی بشیر الدین احمد صاحب سے
معلوم ہوا کہ انتقال سے پہلے زبان بند ہو گئی تھی جبتک بولنے کی طاقت رہی کر جدا زبان پر رہا
اور عبرت خیز جملے فرماتے رہے انکی صاحبزادی نے علاج کے لئے دریافت کیا تو کہا تمہیں اچھا ہے مرد بدست زندہ

شمس العلما مولانا حالی مرحوم

انتقال سے چند سال پہلے کا ذکر ہے مولانا دہلی میں مجھی نواب محمد کریم اللہ خاں
عرف سے خاں صاحب کے مکان پر مقیم تھے جو مٹیا محل میں واقع ہے میں نے
عرض کیا کسی دن درگاہ شریف کی زیارت کو چلیئے اور ہٹی کے محل دیکھئے۔
مٹیا محل میں کبتک رہیئے گا۔ فرمایا وہاں کی حاضری میری سعادت ہے۔ وہاں
ہٹی کے محل نہیں ہیں ظاہر میں ہی سنگ مرمر اور طلائی نقرئی عمارتیں ہیں اور باطن میں بھی
ایک دن میں نے کہا مولانا شبلی آپ کی تصویر دیکھ کر کہتے تھے کہ جیسی تصویر
مولانا حالی کی کھچی ہے اور اس سے انکی فلسفیانہ شان معلوم ہوتی ہے ایسی
آجتک میں نے کسی مسلمان کی نہیں دیکھی۔ فرمایا انکی عنایت ہے جو ایسا خیال
کرتے ہیں مگر میں بعض قبروں کو دیکھتا ہوں تو ان سے میرے دل پر خود
بخود یہ اثر ہوتا ہے کہ یہ شخص زندگی میں فلاں مرتبہ کا ہوگا حضرت محبوب الٰہی
کے مزار پر جاکر مجھے انکی زندہ تصویر محسوس ہونے لگتی ہے۔

ایک دن خواجہ تصدق حسین صاحب ڈسٹرکٹ جج دہلی کے مکان پر ٹھہرے
ہوئے تھے۔ جو ملاقی بیگم کے کوچہ میں ہے۔ میں نے کہا۔ اس محلہ کے سامنے
سنا ہے بہت محلے آباد تھے جو غدر ۵۷ء میں ڈھا دئے گئے۔ فرمایا۔ ہاں
بڑی گنجان آبادی تھی۔ پھر کچھ دیر چپ رہ کر ایک شعر پڑھا جو مجھے یاد نہیں
مگر مطلب سکا یہ تھا کہ آدمی ایسی آبادی اور پھر آخر کی ویرانی کو سوچتا رہے
تو ماہر کے انقلابات اسکو دنیا اور آخرت میں مفید ہوں۔

علی گڈھ میں کانفرنس تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم اور شیخ غلام محمد مرحوم مالک اخبار وکیل اور مولانا حالی ایک جگہ جمع تھے۔ میں نے کہا مولانا کا تخلص ایک درویش کا سا ہی نواب محسن الملک ہنس کر بولے آپ انکو بھی فقیر بنا دیجیے مولانا نے فرمایا۔ فکر آخرت کو استقبال کا رمانہ سمجھتے ہیں۔ حال عیال کیا جائے تو ہر شخص حالی اور فقیر بن جائے۔ میں نے کہا تو پھر نواب صاحب کو چندہ کون دے۔ فرمایا دل کا اور بلا خواہش منود چندہ اسی وقت آئیگا۔ اور اتنا آئیگا کہ نواب صاحب سے لیا بھی نہ جائے۔

اسی موقع پر دوسری صحبت میں ایک شخص نے کہا آپکے مسدس نے قوم کو زندہ کر دیا۔ وہ بولے۔ زندہ ہو کر مرنے کو سو بہولے تو بات ہی۔

پانی پت میں ایک دن میں حاضر خدمت تھا حضرت قلندر صاحب کا ذکر گیا فرمایا جسکو موت عزیز ہوتی ہی انکی زندگی بھی بستاں دار رہتی ہی۔ اور مرنے کے بعد بھی وہ زندوں کی طرح ہر دل عزیز رہتے ہیں۔

ایک دن دہلی کے اسٹیشن پر ملاقات ہوئی۔ کہیں جا رہے تھے۔ میں نے کہا علالت میں اور ضعیفی میں سفر بہت دشوار ہی۔ فرمایا۔ ریل میں کچھ مشکل نہیں۔ البتہ آخرت کا سفر ذرا کٹھن ہی۔ جوانی کی طاقت میں مرنا ہو تو حسرت تو زیادہ ہوتی ہے مگر جسم کی قوت موت کو آسان کر دیتی ہے ڈڈھا مرتا ہے تو تیمارداروں کا وبال جان ہو جاتا ہی۔

انکے صاحبزادے مولوی سجاد حسین صاحب سے میں نے دریافت کیا کہ وقت آخر مولانا کی کیا حالت تھی تو انہوں نے جواب میں لکھا۔

غفلت کی حالت زیادہ تھی۔ سوائے آہستہ آہستہ خدا کا نام لینے کے
اور کوئی بات انہوں نے رحلت کے وقت نہیں کی۔

نواب محسن الملک مرحوم

علی گڈھ میں امیر کابل مہمان تھے اور لڑکوں کا دینی امتحان لے رہے
تھے۔ نواب صاحب کمرہ سے باہر آئے۔ اور دروازہ پر مجھ سے ملے
میں نے کہا۔ کہئے اندر کیا ہو رہا ہے۔ بولے اس وقت دعا ہے امتحان
لے رہے ہیں ایسا نہ ہو لڑکے رعب میں آکر الٹا سیدھا جواب دیدیں
اس وقت نواب صاحب بہت پریشان اور سراسیمہ تھے۔ میں نے
کہا۔ جو لوگ دعا کے قائل نہ ہوں انکو یہ بات نہ کہنی چاہئے۔ بگڑ کر بولے
واہ تمکو ہنسی سوجھی ہے یہاں دم پر بنی ہے۔ میں دعا کا منکر کب ہوں۔
ماتم بھی عوام کی طرح محکوسے دین تصور کر رہے ہو۔
میں نے کہا خدا نہ کرے۔ میں تو ہنستا کب تھا۔ میں تو یہاں کھڑا دعا کر رہا ہوں
کہ خدا آپ کو آخرت کے امتحان میں بھی کامیابی دے۔ یہ سن کر نواب صاحب
کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور دوڑ کر مجھکو لپٹ گئے اور کچھ رہے اس میں

انتقال سے ایک مہینہ پہلے بمبئی میں مقیم تھے اور میں روزانہ ان سے
ملا کرتا تھا شام کے وقت ہوا خوری کو ساتھ جاتے تھے۔ ایک دن جو یائی
پر نواب زادہ نصر اللہ خاں کے بنگلہ پر گئے۔ انسے مل کر باہر نکلے تو ان کی
فقیر دوستی کا ذکر کرنے لگے میں نے کہا آج کل کی اصطلاح میں تو یہ حمق

فرار پائیں گے جو خلاف عقل باتوں کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہنے لگے جا
وکلا۔ میں انکو بڑا عاقل سمجھتا ہوں اور دانشمند وہی ہے جو عقبیٰ کو یاد رکھے
اور اسکے لئے کچھ ساماں جمع کرتا رہے۔

بمبئی میں ایک دن سمندر کے کنارے پہاڑی بنگلہ پر تھے میرے ساتھ
مغرب کی نماز پڑھی میں نے سورہ الہٰکم التکاثر اول رکعت میں تلاوت
کی اور دوسری میں انا اعطینا۔ نماز کے بعد کہنے لگے۔ آپنے تفاخر کو مقدم
اور کثرت حیات کو موخر کہا مجھے اس سے بڑی تقویت ہوئی۔ جو شخص آخرت کو مقدم
رکھے گا اسکو حیات وسیالا زوال ملے گی۔ میں نے کہا زرتم المقابر پر آپکا
عمل کم دیکھا کہنے لگے امت میں تکاثر بھی تو اب کم ہے۔

ایپکس واٹس ہوٹل بمبئی میں بیٹھے تھے۔ نواب صاحب کے سر میں کوئی
زخم تھا جراح نے اسکا کھرنڈ چھیلنا چاہا تو کہا۔ اب میں کھرنڈ صاف کرتا
ہوں۔ بولے پوچھتا کیا ہے۔ چھیل ڈال میں نے کہا تکلیف کی اطلاع
دیتا ہے کہنے لگے خدا نے موت کے سوا آجتک کسی تکلیف کی اطلاع
نہیں دی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جسم میں تکلیف ہو تو اسکا حس کم ہوتا ہے اور یہ بھی
ثابت ہوتا ہے کہ موت تکلیف کی چیز نہیں ہے ورنہ اسکی اطلاع سب کو ملتی۔

شملہ جا رہے تھے۔ اور یہ میری آخری ملاقات تھی کیونکہ اسی سفر میں شملہ میں
ان کا انتقال ہو گیا۔

آ۔ آ۔ سماج نوکر نے آکر کہا۔ سرکار میں ہمراہ نہ جاؤں گا۔ مجھے گھر جانے
کی اجازت دیجئے۔ کہنے لگے۔ جا۔ پوچھتا کیا ہے۔ میں بھی اپنے گھر جاتا ہوں

تو بھی اپنے گھر جا۔
میں نے کہا آپ کا گھر شملہ پر ہے یا قبلہ پر۔ مسکرا کر بولے قبلہ والے کی اطاعت کروں تو قبلہ ہی گھر ہے۔ یہ نوکر بڑا ستم پرست ہے۔ روز ستاتا ہے مگر میں جب سوچتا ہوں کہ اپنے آقا کی نافرمانیاں کرتا ہوں اور وہ رزق دینے سے ہاتھ نہیں کھینچتا تو ان مجازی ملازموں کی ستم سانیاں ناگوار نہیں ہوتیں۔
میں نے کہا آپ کا آقا یہاں کچھ نہ کہے۔ آخرت میں تو اعمال کا اور نوکری کا حساب لے گا۔ یہ سن کر نواب صاحب رونے لگے اور کہا۔ ہاں بے شک سچ کہتے ہو۔ مجھے ہر خوشی کے موقع پر مرنے کا خیال ضرور آ جاتا ہے اور میں خدا کے حساب سے ڈر جاتا ہوں۔ اس سے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ خوشی پر گھمنڈ اور تکبر پیدا نہیں ہوتا۔

شمس العلما خان بہادر مولانا ذکاء اللہ مرحوم

ایک دن دہلی کی پبلک لائبریری میں مولانا تشریف رکھتے تھے۔ میں اور شنکر لال بیرسٹر دہلی آ بیٹھے باتیں کرنے لگے۔ باتوں میں غدر ۱۸۵۷ء کا ذکر آ گیا۔ مولانا نے کہا غدر میں اسی کمپنی باغ کے اندر میں نے ایک انگریز کی لاش دیکھی جو دھوپ میں پڑی تھی اور چربی پگھل پگھل کر زمین پر بہ رہی تھی۔ مجھے اس سے بڑی عبرت ہوئی اور موت یاد آ گئی۔
شنکر لال نے ہنس کر کہا۔ اوہ آپ کو بھی موت یاد آ گئی۔ مولانا کو

یہ فقرہ ناگوار ہوا اور وہ چپ ہو گئے شنکرلال چلے گئے تو مولانا نے مجھ سے فرمایا۔ یہ لوگ آزادی کے نشہ میں ہم بڈھوں کو سرکار انگریزی کا جو شادی سمجھ کر ہنسی میں اڑاتے ہیں میں نے تو ایک بات کہی تھی۔ موت کا یاد کرنا تو مسلمانی کی نشانی ہے۔ میں ہر روز ایک مرتبہ مرنے کا تصور ضرور کرتا ہوں۔ اور اس سے مجھے دنیاوی کام کاج میں بڑی مدد ملتی ہے میں نے کہا یہ کیونکر۔ فرمایا جسکو مرنے کا ہر وقت خیال رہے تو وہ وقت بے کار نہیں کھوتا اور جلدی جلدی کام کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جو کچھ کرنا ہے آج ہی کر لینا چاہیئے کل خبر نہیں زندگی رہے یا نہ رہے۔

مولانا کا آخر وقت آیا تو انہوں نے دہلی کے ایک مشہور چشتی نظامی درویش جناب میاں عبدالصمد صاحب کو بلایا اور انکے ہاتھ پر توبہ کی اور انکے بتائے ہوئے اوراد و اشغال پڑھتے پڑھتے جان دیدی

نوابؒ وقار الملک مرحوم

کی نسبت تو کچھ لکھنا عبث ہے ہر شخص انکی مذہبی مشغولیت اور عبادت گزاری سے آگاہ ہے تاہم چند مقولے دلچسپ یاد تھے ان کا ذکر اس سلسلہ میں موزوں معلوم ہوا۔

ایک دفعہ علی گڈھ میں ان کا مہمان تھا اور بارہ والے بنگلہ میں ٹھیرا ہوا تھا اس بنگلہ پر چھپر پڑا ہوا ہے میں نے باتوں باتوں میں کہا۔ اس بنگلہ کا نام

تار والہ ہے۔ مگر یہاں تار کا سلسلہ نظر نہیں آتا۔ آپ چونکہ خدا سے تار برقی باتیں کیا کرتے ہیں اس واسطے اس کا نام تار والہ مشہور ہوا ہوگا۔ یا جہیر کے جتنے مکان ہوتے ہیں ان میں خدا کے تار آیا کرتے ہیں۔

نواب صاحب بہت ہنس اور خوش مزاج تھے۔ فرمانے لگے معاذ اللہ میری کیا ہستی ہے جو خدا کے تار مجھ تک آئیں۔ مجھے تو ایسے تار لفس کا کھٹکا لگا رہتا ہے دیکھئے یہ وہاں کیونکر رسائی پائے گا۔

ایک دن اسی بنگلہ میں فرمانے لگے کسی کامل درویش کا پتہ بتائیے جس سے باطن کی اصلاح کراؤں۔ میں نے حضرت مولانا شاہ بدرالدین قادری چشتی سجادہ نشین پھلواری ضلع پٹنہ کا نام لیا۔ بولے موقع ہوا تو خود حاضر ہولگا۔ میں نے کہا۔ آپ مسلمانوں کی خدمت کر رہے ہیں یہ سب سے بڑی اصلاح باطن کی ہے اگر کام ایمان اور دیانت سے ہو۔ چشم پرآب ہو کر بولے۔ یہی خوف تو ہے کہ پیرانہ سالی نے کمزور کر رکھا ہے ایسا نہ ہو کوئی غلطی سرزد ہو جائے اور عاقبت برباد ہو۔ لوگوں کو بڑا بننے کا شوق ہے۔ اور میں دیکھتا ہوں کہ بڑائی میں بڑے بڑے خطرے ایمان کے لئے ہیں۔

ایک دن حاذق الملک صاحب کے ہاں دہلی میں ملاقات ہوئی۔ میں نے ایک تسبیح تحفہ میں دی فرمایا دعا کیجئے اسکے پڑھنے کی توفیق ہی ہو۔ میں نے کہا آپ پڑھیں یا نہ پڑھیں مجھے اس سے کچھ سروکار نہیں۔ اسکو روز دیکھ لیا کیجئے کہ اس کا امام سب دانوں کی شیرازہ بندی کا ذمہ دار ہے۔ یہ سن کر خاموش ہو گئے۔ اور دیر تک نہ بولے۔ میں نے کچھ اور ذکر چھیڑا تو اس کا جواب ہی نہ دیا۔ اتنے میں حکیم صاحب آ گئے۔ اور نواب صاحب ان کے ہمراہ سوار ہو کر اور سلام کر کے چلے گئے مجھے

خیال ہوا نواب صاحب نے میرے کہنے کا برا مانا۔ دوسرے دن پھر ملا۔ تو فرمایا آپ کی بات مرتے دم تک یاد رہے گی کل مجھ پر اس قدر اثر ہوا کہ میں اپنی موجودہ ذمہ داری سے ڈر گیا۔ میں نے کہا مبارک ہو ڈرنے والے کی عاقبت بخیر ہے۔

نواب صاحب کے صاحبزادہ مشتاق احمد بیمار تھے۔ اور نواب صاحب ان کے ساتھ کالکا قریب درگاہ حضرت محبوب الٰہیؒ میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ میں مزاج پرسی کو گیا۔ تو چلتے وقت فرمایا۔ بچہ کی صحت حیات اور میری صحت ممات کے لئے دعا کیجے۔

ایک دفعہ ریل میں ساتھ ہوا۔ نواب صاحب کے ہمراہ جانماز اور وضو کا لوٹا ضرور ہوتا تھا میں نے کہا اگلے زمانہ میں مسلمان مسافر کفن ہی ساتھ رکھتے تھے۔ اب بڑوں میں صرف آپ باقی ہیں جو جانماز اور لوٹا مسواک تو کم سے کم ساتھ رکھتے ہیں۔ کہنے لگے۔ یہ تو اللہ کا حق ہے اور کفن بندہ کا حق ہے۔ خدا کا حق ادا ہو جائے تو بندگی کے حق کا وہ خود سامان کر دے گا۔

ایک مسلمان کی سفارش لیکر علی گڈھ میں انکے پاس جانا ہوا۔ تو انہوں نے اسکی تعمیل سے انکار کیا۔ مجھے سو کھا جواب ناگوار گزرا۔ اور میں نے بے ساختہ کہا۔ ڈریئے موت کا وقت قریب ہے آپ ایک بیکس مسلمان کی مدد سے انکار کرتے ہیں ایسا نہ ہو مرنے کی بیکسی میں خدا بھی آپ کی مدد سے منہ پھیر لے۔ میری درشت کلامی سے ناراض نہ ہوئے۔ اور فرمایا۔ آپ نے بہت خوب ارشاد کیا خدا جس مدد کرنے کی طاقت ہو وہ کبھی اپنے بیکس بندہ سے منہ نہ پھیرے گا

اور مجھ میں طاقت نہیں تو کیونکر اقرار کروں۔

اسکے بعد انہوں نے انکار کی وجوہات کو مفصل بیان کیا۔ اور میں نے مان لیا کہ بے شک نواب صاحب کے اختیار سے وہ کام باہر تھا۔

مسٹر آرچبولڈ پرنسپل کالج سے نواب صاحب کی ان بن ہو رہی تھی۔ اسلامی و ملکی اخبارات نواب صاحب کی حمایت میں دھواں دھار مضامین لکھ رہے تھے اسی زمانہ میں ایک دفعہ ملاقات ہوئی۔ میں نے کہا ان دنوں آپ کو بہت مصروفیت ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حق پر آپ ہیں یا فریق ثانی۔ فرمانے لگے لوگوں نے مخالفت سمجھ رکھی ہے۔ حالانکہ محض اختلاف رائے ہے۔ وہ فرد حاکم میں فرد محکوم۔ میرا ان کا مقابلہ کیا۔ بفرض محصی کی کشمکش تو زندگی کا لازمہ ہے مجھے تو فکر نفس و شیطان کا رہتا ہے جو ہر وقت آخرت اور عاقبت کی بربادی پر تلے ہوئے ہیں اور ہم اس سے بے خبر ہیں۔

شمس العلما مولانا شبلی مرحوم

دہلی میں ایک دفعہ مولانا حقیر خانہ پر تشریف فرما تھے بازار میں کوئی شخص گاتا جاتا تھا۔ فرمایا اسکو یہاں بلانا چاہیئے۔ بلا لیا گیا۔ اس نے گایا۔

بام پر نکلا نہ کر اے ماہ رو
چاندنی چھو جائیگی۔ میلا بدن ہو جائیگا

محظوظ ہوئے۔ گانے والا گیا۔ تو فرمانے لگے۔ چاندنی سے بدن میلا ہونے کا شاعر کو ڈر ہوا۔ مگر بام پر چڑھ کر تو نور ایمان کی صفائی بھی دشوار ہوتی ہے۔ میں نے

کہا حساب بھی آجکل بالاخانہ پر ہیں ہنسکر بولے لحد کے مردوں کے ساتھ بالاخانہ پر چڑھے ہے تو کچھ ڈر نہیں عرض کی یہ تو صحیح نہیں۔لحد کا مردہ تو ازبس آلودۂ تربت ہوتا ہی۔ فرمایا۔عشاق کی تربت قفس خاک نہیں عالم پاک ہی۔

اسی زمانہ میں میری اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔ وہ درگاہ کے مکان میں تھیں۔اور مولانا دہلی کے مکان میں میت کو دفن کرکے ہی میں دہلی گیا۔ اور مولانا کو کھانا کھلانے لگا۔ انہوں نے پوچھا کہو بیوی کیسی ہیں میں نے کہا اچھی ہیں کہا ما ساد لی کیجئے۔ فراغت ہوئے تو میں نے مرنے کا ذکر کیا۔ بے اختیار ہائیں کہکر بولے بہئی کمال کیا۔ ہمیں بیوی کا کچھ غم نہیں میری بیوی مری تھیں تو اسی دن مولانا ابوالکلام مہمان آئے اور مجھ سے ویسے ہی طرح بات بھی اُٹھنے نہ ہو سکی

پھر فرمایا۔موت بھی عجب چیز ہے بعض اموات انسان پر اچھا اثر کرتی ہیں بعض بُرا خود اپنی موت کے خیال کا بھی یہی حال ہی۔ خوشی میں ناگوار ہوتا ہی اور رنج میں بھلا معلوم ہوتا ہے میں نے کہا اپنی کیفیت فرمائیے کہ آپ موت کی نسبت کیا تصور کرتے ہیں کہنے لگے۔زندگی مدوہ ہی۔ اور موت تمہارا گھر۔ وہاں رات دن کے افکار ہیں یہاں ہر وقت کی مسرت۔

بھئی ہیں ایک دن ملا شگفتہ مزاجی کی بے تکلفانہ گفتگو تھی میں نے کہا جوپاٹی کے حسن کو آپ نے کلام میں بقائے دوام دیکر برج خاموش کو ستا کی سنا دیا ہے۔ فرمانے لگے۔کیونکر۔ میں نے کہا پارسی مرتے ہیں تو برج خاموش میں رکھہ دیے جاتے ہیں عارضی زندگی کی بہار جوپاٹی پر دیکھ کر آپ نے غزلیں لکھہ دیں۔ اب برج خاموش کو شکوہ ہے کہ جہاں یہ حسین دوامی عمر بسر کرنے جاتے ہیں

مولانا نے اس کا ذکر کچھ نہ کیا۔ مسکرا کر فرمایا یہ آپ کے لئے چھوڑ دیا۔
میں بولا۔ تو حسن آخرت کے آپ قائل ہیں۔ فرمایا حسن آخرت ہی کے لئے حیات متحرک کے حسن کا قائل ہوں۔ آخرت نہ ہو اور اسکو دوام نہ ہو تو جینے اور چند روزہ بہار کی اتنی زیادہ ہوس نہ ہو۔ میں نے کہا مجھے تو حسن دیکھ کر مرنے کا خیال آتا ہے۔ اور اس سے جی عجب لطف اٹھا تا ہے۔ فرمایا مجھے آپ کی حالت پر ترس آتا ہے۔

مدراس کے سفر میں ایک دفعہ ساتھ ہوا۔ وہ سکنڈ میں تھے۔ اور میں تھرڈ میں مسافروں کی شدت ہوئی تو انہوں نے نوکروں کے درجہ میں بیٹھ جانے کی صلاح دی۔ میں بیٹھ گیا۔ سکنڈ اور نوکر خانہ کی درمیانی دیوار میں ایک کھڑکی تھی۔ مولانا نے کچھ مٹھائی کھڑکی میں سے ہاتھ نکال کر مجکو دی۔ میں نے ہنس کر کہا۔ جنت والوں پر دوزخیوں کو کچھ دینا حرام ہے۔ بولے۔ آپ تو اعراف میں ہیں گاڑی مدراس پہنچی تو استقبال کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ میں نے مولانا کے کان میں کہا۔ کہہ دوں مولانا تھرڈ میں آئے ہیں اور میں سکنڈ میں۔ فرمایا کہو عاقبت دونوں کی ایک ہے۔ یہ تو دنیا کی منزل تھی طے ہو گئی۔ آخرت آ گئی تو دنیا کی تھرڈ و سکنڈ کے امتیاز اٹھ گئے۔

لکھنؤ میں مولانا کا مہمان تھا۔ ان کے ہاں ان دنوں ایک عرب لڑکا خدمت کرتا تھا۔ اور دروازہ پر بیٹھے رہنے کی اسکو ہدایت تھی۔ میں نے اندر جانا چاہا تو لڑکے نے روکا میں نے آواز سے کہا شمس علی فقیر اسم کے دروازہ پر دربان۔ آتی تیری اماں خود باہر آ کر اندر لے گئے اور معذرت کرنے لگے میں نے کہا

اگر عزرائیل آئے تو یہ دربان روک سکیگا؟ فرمایا اُن ہی کے لئے تو بٹھایا ہے۔ وہ عربی بولتے ہیں۔ ہندی دربان کی بات نہ سمجھتے۔ اسکے بعد سرسید کا ذکر آگیا کہ وہ موت کی نسبت پورا یقین رکھتے تھے۔ یعنی موت کے بعد حیات دوامی کے قائل تھے۔ میں نے پوچھا آپکا موت کی نسبت کیا خیال ہے۔ فرمایا سبحان اللہ میری کیا بساط ہے جو اس پر کچھ خیال کروں۔ تغیر عالم شاہد ہے کہ موت آئیگی مگر میں موت کو افسوس کی چیز نہیں سمجھتا۔ اور اسی قوم کو زندہ مانتا ہوں جو موت سے خوف نہ کرتی ہو۔ اس زمانہ میں سوائے مسلمانوں کے کوئی دنیا میں ایسی والی قوم موت پر اس قدر شیفتہ نہیں ہے جتنے مسلمان ہیں۔ اور خدا کا احسان ہے کہ میں اُسی برگزیدہ قوم کا ایک فرد ہوں۔ حسن نظامی

گل و بلبل کی موت

۶۸۹

از جناب منشی عبد الخالق صاحب خلیق دہلوی
خاص رسالہ کم ٹو موت کے لئے

بہاروں سے بنا تھا باغ صدر شک پریخانہ ۔ کہیں گل محو آرائش کہیں بلبل تھا دیوانہ
نسیم علیش اپنی چل رہی تھی چال مستانہ ۔ گلوں کا بادۂ شبنم سے تھا لبریز پیمانہ
شمیم روح پرور اُڑ رہی تھی مشکبو ہو کر
کنول دل کے کھلاتی تھی بہار آرزو ہو کر

گل جوش رنگ اپنی تازگی پر ناز کرتا تھا ۔ عروس حسن سے انداز پر اصرار کرتا تھا
نسیم جاں فزا کو ہمدم و ہمراز کرتا تھا ۔ زمانہ ساز بن کر بلبلوں سے ساز کرتا تھا

فدا سو جاں سے بلبل تھا گل کی بات کے اوپر
کبھی اس ڈال کے اوپر کبھی اس پات کے اوپر

رجھانے کے لئے معشوق کو جیسے ستاتا تھا — کبھی ٹپہ کبھی ٹھمری کبھی دھرپت اڑاتا تھا
خوشی سے پھول کر پھولا نہ جامے میں سماتا تھا — وصال گل سے پروانہ کو محفل میں جلاتا تھا

کہ واصل ہو معشوقوں سے ہم سے سیکھ پروانے
فراق شمع میں کب تک جلے جائیگا دیوانے

اگر عاشق سا ہی عاشقی کی شان پیدا کر — دل پر غم میں حسرت آرزو ارمان پیدا کر
نگاہوں میں مزاج یار کی پہچان پیدا کر — اگر مشکل کٹھن ہو راستہ آسان پیدا کر

در جاناں پہ سر گھسنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا
کہ جل جانے سے کوئی عاشق کامل نہیں ہوتا

غرض یوں طعنہ زن تھا عاشقوں پر بلبل گلشن — کبھی کھٹ پٹ تھی پروانے سے قمری سے کبھی ان بن
ہزاروں ہیں جہاں میں یوں تو کہنے کیلئے کامن — یہ لیلے میں یہ خوبی ہو نہ شیریں میں ہی یہ جوبن

حسیناں جہاں گل کی برابر ہو نہیں سکتے
جو عاشق ہیں وہ بلبل کی برابر ہو نہیں سکتے

گل و بلبل میں جاری تھیں یہی اسرار کی باتیں — محبت میں مزے سے ہو رہی تھیں پیار کی باتیں
کبھی تقریر تبسم کی کبھی گلزار کی باتیں — گلے میں ہاتھ ڈالے یار سے تھیں یار کی باتیں

بلا آئی غضب ٹوٹا ستم ایجاد آپہنچا
ادھر گلچیں ادھر بیداد گر صیاد آپہنچا

گلوں کو لیگیا چن چن کے گلچیں اپنی جھولی میں — حسیں گلباریاں کرتے رہے پھولوں سے ہولی میں

تب عشرت کسی نے رکھہ دیا سوچ سے جو لی میں حلیق رار نے یہ شعر لکھا اپنی بولی میں

قفس میں مرگیا بلبل ہوئی یہ لونکی پامالی
گل و بلبل کی باقی رہ گئی ہی داستان خالی

بادشاہوں اور نامور لوگوں کے آخری کلمے

یعنی وہ کلمات جو دم نکلتے وقت اُنکی زباں سے نکلے۔ جنکے بعد وہ اور کچھ نہ کہہ سکے۔ اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔

جان رچرڈ گرین (ایک مشہور مورخ) اپنی انگلی نبض پر رکھہ کر ڈاکٹر سے مسکراکے کہا
"نبض بند ہو گئی لو الوداع"

فیلپ (ایک مشہور ایکٹر) "الوداع تمام میری عظمت کو الوداع"

شہنشاہ رچرڈ اول (سر برٹرلنڈ ڈی گورڈن سے کہا جسکے تیر سے وہ ہلاک ہوا تھا)
"اے جوان میں تجھکو معاف کرتا ہوں"

الگزینڈر اول بادشاہ روس (اپنی ملکہ سے)
"ایلزبتھ آپ تھک گئی ہونگی"

کریمویل "جتنی جلدی ممکن ہو میرا ارادہ چلے جانے کا ہے"

لوئیس پانزدہم (اپنے تیمار داروں سے)
"تم کیوں روتے ہو۔ کیا تمہارے خیال میں میں ہمیشہ زندہ رہوں گا"
"میرا خیال تھا کہ مرتے وقت زیادہ تکلیف ہوتی ہو گی"

لوئیس شانزدہم بادشاہ فرانس (جلاد کے سامنے)

"فرانس میں جو جرم مجھ پر لگائے گئے ہیں میں اُن سے بےگناہ مرتا ہوں"
"خدا سے دعا ہے میرا خون فرانس کے ذمہ نہ ہو۔ اگر ایسا . . . ."

چارلس اول "یاد رکھو"

چارلس ثانی "بیچاری نیلی کو بھوکا مت رکھنا"

جیمس پنجم والی اسکاٹ لینڈ (مرتے وقت ایک لڑکی کے تولد کی خبر سنکر)
"یہ تاج ایک لڑکی سے آیا تھا اور لڑکی کو جائے گا"
(پیدا ہونے والی لڑکی ملکہ میری اسکاٹس کے نام سے مشہور ہوئی)

ملکہ وکٹوریا کے شوہر "مجھ کو دولت، رتبہ، اور اختیار حاصل ہوا لیکن اگر مجھ کو صرف یہی چیزیں نصیب ہوتیں تو میں کیسا مصیبت زدہ ہوتا"

ملکہ ایلزبتھ۔ "میرے تمام مقبوضات ایک لمحہ کے لئے اور ہیں"

ولیم سوئم۔ "کیا یہ درد زیادہ دیر تک رہیگا"

چارلس نہم۔ "دایہ، دایہ، کیا قتل، کیا خون ہے، اور میں نے غلطی کی ہے خدا مجھے معاف کرے"

رچرڈ سوئم۔ "بغاوت! بغاوت!!"

گیری بالڈی۔ (دو پرندوں کو اپنے کمرہ کی چوکھٹ پر بیٹھا ہوا دیکھ کر اور اُنہیں اپنے مرحوم بچوں کی روحیں سمجھ کر)
"محبت سے دونوں اپنے باپ کو مرتا ہوا دیکھنے آئے ہیں میرے مرنے کے بعد ان پر مہربانی کرنا اور دانہ کھلانا"

امیر البحر نیلسن (ملاحوں سے)
"انگلستان اپنے ہر ایک فرزند سے امید رکھتا ہے کہ وہ اپنا فرض پورے طور سے ادا کریگا"

لوئیس ہشتدہم بادشاہ فرانس۔

"بادشاہ کو کھڑے ہو کر مرنا چاہیئے"

شہنشاہ جارج دویم

"بوئے۔ یہ کیا ہے۔ مجھے ڈر کا معلوم ہوتا ہی۔ موت آرہی ہی لیکن لوگ سب مجھے ٹھگ رہے ہیں"

ولیم سویم

"یہ تکلیف مدت تک رہے گی"

ملکہ این بولین (جس وقت اسکی گردن پر قتل کرنے کے لئے کلھاڑا اچلایا گیا)

"میری گردن نہایت چھوٹی ہے"

ملکہ ایلزبتھ۔

"اگر مجھے زندہ رہنے کے لئے ایک منٹ اور مل جائے تو میں اپنی تمام دولت دیتی ہوں"

شاہ ہنری ہشتم

ڑہے جاؤ۔ بڑہے جاؤ

حسن نظامی

خاتمے کے بیان کا خاتمہ ہوا

۷۸۶

مُردہ دل خاک جیا کرتے ہیں!

جیتا ہی تو دو گھڑی ہنس بول۔ زندگی زندہ دلی کا نام ہی۔ دنیا میں جو ایک سانس لیکر آیا ہی۔ چاہے رونے میں کاٹ چاہے ہنسی خوشی میں گزار۔ خدا یہ نہیں چاہتا کہ تو ایسا ہنسے کہ مرنے کو بھول جائے۔ اُسکی یہ مرضی ہے کہ موت کو یاد کرتے کرتے جینے سے ہاتھ اُٹھا لے جیسا بھی فرض ہے مرنا بھی فرض ہی۔ جی تو خوش باش جی۔ مر تو خوش باش مر+

کمٹو موت کے مضامین غم دیکھکر موت کو یاد کیا تو کتاب

چُٹکیاں اور گُدگُدیاں

بھی پڑھ۔ اس سے ہنسی آئے گی۔ دل کی مُردہ اور افسردہ کلی کھل جائے گی کمٹو موت بھی میں نے لکھی اور غم یاد دلایا۔ اور چٹکیاں و گدگدیاں بھی میری ہی تحریر کردہ ہیں اس میں مذہبی ہنسی کی باتیں ہیں۔ تمدنی ہنسی کی باتیں ہیں۔ ادبی اور انشاپردازی کی ظرافتیں ہیں ہر مضمون کچھ یاد دلاتا ہی چٹکیاں لیکر چونکاتا ہی۔ پھر گدگداتا ہی اور بے اختیار ہنسی چہرہ اور دل پر لاتا ہی جس نے کمٹو موت کو پڑھا اور چٹکیاں گدگدیاں بھول گیا اُس نے جینا نہ جانا وہ چٹکیوں اور گدگدیوں میں رہ گیا اور کمٹو موت تک ہاتھ نہ بڑھایا۔ اُسکو مرنا نہ آیا+

اے بیخبر! جبتک جئے ہنسی دل لگی سے جی۔ میری چٹکیوں کے لئے بازو جھکا۔ میری گدگدیوں کے واسطے بغل کھول۔ کہ میرا نام حسن نظامی ہی+

یہ بھی کرتا رہ۔ اور موت کو بھی دھیان میں رکھ۔ کمٹو موت آخرت یاد دلاتی ہی۔ اس واسطے بیش قیمت ہی۔ ایک روپیہ میں آتی ہے چٹکیاں گدگدیاں دنیا کی ہنسی اور تفریح کے حوالے میں لہذا اس کی قیمت فقط آٹھ آنے ہیں۔ آخرت پوری ہے دنیا ادھوری ہے جسکو مطلوب ہو

پیرزادہ سید محمد صادق صاحب

کارکن حلقہ المشائخ صوبہ دہلی کے نام درخواست بھیجکر منگائیے

قبروں کے غیبی نوشتے

اچھی قبر اور بُری گور کے ادبی نظارے اس کتاب میں ہیں۔ ہر قبر ایک نوشتہ اپنے اوپر رکھتی ہے مگر آنکھ پڑھنے کی صلاحیت کہاں سے لائے۔ غریبوں کے گورستان۔ امیروں کے مقبرے۔ اولیاء اللہ کے مزارات سب قدرت کی الواح مخفی سے گوناگوں ہیں۔ ہر تودۂ خاک کے سرہانے مرنے والے کا اعمال نامہ لکھا ہوا ہے۔

مجھکو بھی نگاہ کی تلاش تھی جس سے مکتوبات مقابر کو پڑھتا مگر آہ اب تک نہ ملی۔ لاچار قوت ذہن اور طاقت خیال سے کام لیا۔ اور پہلے سرور کائنات حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار اطہر کے سرہانے ایک تصوری لوح قائم کرکے دیکھی اور اسکی عبارت ظاہر کرکے کاغذ پر نقل کرلی۔ پھر سیدۂ عالم بی بی خدیجہ رضؓ اور بی بی فاطمہ رضؓ کے مزارات کی الواح نقل کیں پھر سیدنا حضرت علی رضؓ حضرت امام حسینؑ حضرت علی اکبر رضؓ حضرت علی اصغر رضؓ حضرت بلال رضؓ حضرت [illegible] حضرت [illegible] وغیرہ کے کتبات قبور تحریر کیے۔ اسکے بعد ابولہب ابوجہل یزید۔ شمر۔ ابن زیاد کے کتبے لکھے اور آخر میں اپنے استقبال پر نظر کرکے حسن نظامی کی قبر کو دیکھا تو اسکی لوح بھی لکھ لی۔ اس سب کے مجموعہ کا نام قبروں کے غیبی نوشتے رکھا۔

اس کتاب کو پڑھکر کم تو موت کے پڑھنے کا لطف آئیگا کم تو موت اسکی شرح ہے اور کتاب اگر غور کرو تو کم تو موت کی تفسیر ہے دونوں کا اثر مذہبی ہے۔ تمدنی ہے۔ قومی ہے ملکی ہے ہر انسان کی ضروریات حیات و ممات کو مفید ہے۔ کم تو موت پڑھنے کا مزا جب ہی ہوگا کہ قبروں کے غیبی نوشتے بھی پاس ہوں۔

میں یہ تعریف کسی ذاتی غرض کے لیے نہیں کرتا بلکہ مقصود اصلی کی خاطر اور وہ یہی ہے جو محاورات دیں مصنف ضرور کہتا ہے کہ اولاد آدم کو مرنا بھی آجائے اور جینا بھی سیکھ جائے قیمت اسکی آٹھ آنہ ہے۔

پیرزادہ سید محمد صادق صاحب رکن حلقۃ المشائخ دہلی سے منگایئے